★★★★

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
ماہنامہ
عوامی جمہوریت
لاہور

مارچ 2011ء

سکیورٹی کونسل کی قرارداد کی آڑ میں
نیٹو فورسز کا لیبیا پر حملہ اور تباہی

مانچسٹر یو کے میں فیض اَمن میلہ کا اہتمام کیا گیا

مانچسٹر: بزم ادب مانچسٹر اور نیشنل کمیٹی برائے فیض سو سالہ تقریبات کے زیر اہتمام پاکستان کمیونٹی سنٹر مانچسٹر میں فیض کی یاد میں منعقدہ تقریب سے براڈ کاسٹر رضا علی عابدی، قونصلر جنرل مانچسٹر چوہدری احسان اللہ باٹھ، سابق لارڈ میئر کونسلر محمد عجیب، اے آر انصاری، کونسلر مشتاق لاشاری، رے واکر، دیال سنگھ باگڑی، غزل انصاری، مس جیا زیدی، احمد نظامی، غلام قادر آزاد، پروفیسر نذیر تبسم، ظفر تنویر، محسن ذوالفقار، انیس زیدی، ریاض کھوکھر، رشید سرابا، برمنگھم فیض کمیٹی کے کوآرڈینیٹر مختار ڈار، نیشنل فیض کمیٹی کے کنوینئر پرویز فتح، عباس ملک، جمیل اختر، صفا زیدی، گلوکار عالل پادیر اور عبدالقدوس خطاب کر رہے ہیں

ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان

CPL.NO. 279

شمارہ نمبر 12

جلد نمبر 7

مارچ 2011ء

قیمت 25 روپے

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماہنامہ
عوامی جمہوریت لاہور

اس شمارے میں

فہرست

ادا ریہ

شہباز بھٹی کا قتل		2
لیبیا میں سامراجی عزائم کے لئے بیرونی عسکری مداخلت		2
قومی سلامتی کی ریاست: کیوں، کس کے لیے اور کب تک؟		3

مضامین

عوامی مسائل، سماجی تبدیلی اور سیاسی جماعتوں کا کردار	مقتدا منصور	4
عالمی سٹہ باز مالیاتی انہدام	نجم الحسن عطاء	6
پروفیسر احمد علی اور ترقی پسند تحریک	مسلم شمیم	8
زلزلوں سے کیسے نپٹا جائے	ڈاکٹر غلام مجتبیٰ	12

خبریں

ورکرز پارٹی پاکستان کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس	اختر حسین	14
ورکرز پارٹی پاکستان پنجاب کا اجلاس	ظفر اقبال چوہدری	15
ورکرز پارٹی پاکستان دنیاپور کی تحصیل کانفرنس	مہر وقار حسین	16
ورکرز پارٹی پاکستان کیا چاہتی ہے؟	ماسٹر الٰہی بخش	17
فیصل آباد میں عالمی یوم خواتین منایا گیا	عارف ایاز	18
شاعری		19
مانچسٹر یو کے میں فیض احمد فیضؔ کی صد سالہ تقریبات		20

ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض احمد فیض

ایڈیٹر

نعیم شاکر

مجلس ادارت

عابد حسن منٹو

اختر حسین

مسلم شمیم

رابطہ آفس

5۔میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
Email:nshakir12@gmail.com
اکاؤنٹ نمبر: 01357900053903
حبیب بینک لمیٹڈ مال برانچ لاہور

پبلشر محمد اسلم ملک نے
لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور
سے چھپوا کر 5۔میکلوڈ روڈ، لاہور
سے شائع کیا

شہباز بھٹی کا قتل

دہشت گردی، مذہبی شدت پسندی، فرقہ وارانہ منافرت کے ہاتھوں ہمارے ملک میں آئے روز قتل وغارت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ زندگی ارزاں ہو گئی ہے اور زندہ رہنا محال ہے۔۔۔۔ بم دھماکوں، خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ (target killing) سے پاکستان کے طول وعرض میں اب قریب ہر روز اتنے لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کہ اب تو ان کا شمار بھی سنجیدگی سے نہیں کیا جاتا۔۔۔۔۔ یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے، صرف اس لئے نہیں کہ لوگ [اور زیادہ تر عام اور بے گناہ لوگ] مارے جارہے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ موت کا یہ کھیل انفرادی اور اجتماعی نفسیات کو بھی متاثر کررہا ہے، لوگ بے حس ہوتے جارہے ہیں، انسان کی حُرمت اور انسانیت کے تصورات بے معنی ہوتے جارہے ہیں۔۔۔۔

شہباز بھٹی کا قتل اسی دہشت گردی کا شاخسانہ ہے، تاہم اس سانحہ کی اپنی الگ اہمیت بھی ہے۔ شہباز بھٹی ہمارے ملک کی اس چندفی صد آبادی سے تعلق رکھتے تھے جسے غیر مسلم اقلیت کہا جاتا ہے، مذہبی اعتبار سے وہ مسیحی تھے، اور مرکزی حکومت میں اقلیتوں کے محکمے کے وزیر تھے۔ اس وزارت کا قلمدان مختلف زمانے میں مختلف اقلیتوں کے نمائندوں کے پاس رہا ہے، لیکن اپنے پیشروؤں کی نسبت ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اقلیتوں کے مفادات کے خلاف مذہبی بنیادوں پر بنائے گئے قوانین کے خاتمے یا ان میں مناسب تبدیلی کے لئے فعال تھے۔ ان قوانین میں توہینِ رسالت سے متعلق تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295C بھی ہے جو ضیاء الحق کے عہد میں نافذ ہوئی اور پھر اسی کے عہد کی بنائی ہوئی فیڈرل شریعت کورٹ نے 'توہینِ رسالت' کے جرم کی سزا صرف اور صرف موت مقرر کردی۔۔۔۔۔ اسّی کی دہائی سے ہی جب یہ قانون نافذ ہوا، اس کی مخالفت شروع ہوگئی تھی۔ یہ مخالفت صرف مذہبی اقلیتوں کی طرف سے نہیں کی گئی، تمام جمہوریت پسند اور روشن خیال پاکستانی اس تحریک کا حصہ رہے ہیں اور ہیں۔۔۔۔۔ طالبان نے مذہب کے نام پر جو انسان دشمن ظلم اور دہشت گردی جاری کی اور پاکستان کی 'دینی سیاسی' جماعتوں نے جس طرح ان کا درپردہ اور کھلا ساتھ دیا، اس کے نتیجے میں اس قسم کے قوانین کی مخالفت کرنے والوں میں اضافہ بھی ہوا اور خوف وہراس بھی مزید پھیلا۔۔۔۔۔ شہباز بھٹی کے زمانۂ وزارت میں ہی آسیہ بی بی کا معاملہ سامنے آیا جسے توہینِ رسالت کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی۔ اس سزا کے خلاف آسیہ بی بی کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر ہے، تاہم اسے صدارتی معافی دلوانے کے لئے گورنر پنجاب سلمان تاثیر سرگرم ہوئے تو انہیں قتل کردیا گیا۔ اور پھر شہباز بھٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔۔۔۔۔ اس قتل کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

تاہم ہمارے خیال میں [اور اس بات کا ہم کئی بار اعادہ کر چکے ہیں] کہ یہ معاملہ مذمت تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔ حالات کی سنگینی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ جمہوریت پسند، روشن خیال پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک جدید جمہوری ریاست بنانے کی جدوجہد کو سنجیدہ اور منظم طریقے سے تیز تر کریں۔ یہ جدوجہد کئی جہتوں میں ہونی چاہئے۔ اس میں سول سوسائٹی کے مختلف حصوں کو فعال بنانا ہوگا۔ جمہوریت کے تقاضوں کا شعور عام کرنا ہوگا۔ ریاست اور مذہب کے معاملات کو قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر کی روشنی میں ازسرِنو طے کرنے کی مہم مضبوط کرنا ہوگی۔ نسبتاً منظم اور تعلیم یافتہ طبقات یعنی، وکلاء، ڈاکٹر، استاد، طلباء اور محنت کشوں کی انجمنوں کو ایک وسیع تر تحریک کا حصہ بنانا ہوگا، حکومتوں اور حکومتی پارٹیوں کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ وقتی مفادات اور موقع پرستانہ طرزِ عمل کو ایک طرف رکھتے ہوئے خود اپنے اقتدار کی بنیاد یعنی جمہوریت کو دہشت گردوں اور ان کے سیاسی اور غیر سیاسی حمائتیوں سے آزاد کر کے عوامی مفادات کے تابع کریں۔ تعلیمی اداروں کو رجعتی عناصر سے پاک کیا جائے، تعلیمی نصاب کو عہدِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔۔۔۔۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کیا جائے جو آج تک نہیں کیا گیا اور جس کے بغیر جمہوریت، امن، قانون کی عملداری اور سماجی انصاف کی ابتداء بھی نہیں ہوسکتی۔

مذہبی اقلیتوں کا بھی اس حوالے سے اہم کردار ہے۔ انہیں باشعور پاکستانی شہریوں کی طرح جمہوری تحریک کا حصہ بننا پڑے گا۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ صرف مظلومیت کا اظہار کرنے سے نہیں اس کے خلاف وسیع تر جدوجہد کا حصہ بننے سے ہی ممکن ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ اقلیتی گروہ بھی جمہوریت کے تقاضوں سے آشنا ہوں اور اپنے جمہوری حقوق کے حصول کے لئے عوام کی عمومی جمہوری جدوجہد کا حصہ بنیں۔

☆☆☆☆☆☆

لیبیا کے عوام کے انسانی اور جمہوری حقوق کی جدوجہد اور سامراجی عزائم کے لئے بیرونی عسکری مداخلت

عرب دنیا میں تیونس، مصر اور یمن میں عوامی ابھار کے اظہار اور آمروں کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کرنے والی عوامی تحریک کی کامیابی کے بعد قدرتی امر تھا کہ یہ ابھار آس پاس کی دنیا کو متاثر کرے۔ اس عوامی لہر نے لیبیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

لیبیا میں کرنل معمر قذافی کے 43 سالہ آمرانہ دور کے خلاف لیبیا کے عوام کی مذاحمتی لہر نے لوگوں کی جمہوری امنگوں کو بڑھاوا دیا اور ایک جمہوری جدوجہد کو شکل دی جس کی پاداش میں کرنل قذافی اور اس کے عسکری ٹولہ نے مظاہرین پر بڑی بے دردی سے گولیاں برسائیں اور اس عوامی تحریک کو دبانے کے لئے باقاعدہ زمینی اور ہوائی ملٹری ایکشن کیا جس کے نتیجہ میں ہزاروں مظاہرین ہلاک ہوئے۔ ان مظاہروں میں لیبیا کے سرکاری حلقوں کے تضادات کی بھی نشاندہی ہوتے ہوئے نظر آئی۔

ورکرز پارٹی پاکستان نے لیبیا کی حکومت کے ظلم اور جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور لیبیا کے عوام کی انسانی اور جمہوری حقوق کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔

لیبیا کے عوام نے عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ لیبیا کی حکومت کی بربریت اور لیبیا کے عوام کے کھلے عام قتل کے خلاف آواز اٹھائے مگر تقریباً ایک ماہ تک عالمی طاقتیں لیبیا کے عوام کے خلاف انسانیت سوز مناظر دیکھتی رہیں۔

17 مارچ 2011 کو سیکورٹی کونسل (اقوام متحدہ) نے قرارداد نمبر 1973 کے ذریعے لیبیا کو ''نو فلائی زون'' قرار دیا۔ قرارداد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ قذافی حکومت کے عوام پر فضائی حملوں کے ذریعے ہلاکتوں کو بند کرنے کے لئے نو فلائی زون قرار دیا گیا ہے۔ مگر جونہی قرارداد پاس ہوئی تو فرانس، برطانیہ اور امریکہ اور نیٹو فورسز نے اپنی عسکری قوت استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور اور لیبیا پر فضائی حملوں کا آغاز کر دیا جس سے قذافی کی حکومت کے عسکری ٹھکانوں کو نشانہ تو بنایا گیا مگر ان حملوں سے مظاہرین بھی زد میں آئے اور سینکڑوں شہری ہلاک ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں لیبیا کے شہریوں کا قذافی حکومت کے خلاف احتجاج اور جدوجہد کو شدید نقصان پہنچا ہے جس سے ان کے انسانی اور جمہوری حقوق کی پامالی ہوئی ہے۔ بیرونی قوتوں نے نہ صرف بین الاقوامی قانون بلکہ سیکورٹی کونسل کی قرارداد کی بھی پامالی کی ہے اور لیبیا کے عوام کے جمہوری حقوق کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بیرونی مداخلت دراصل سامراجی عزائم رکھتی ہے تاکہ لیبیا کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کیا جائے اور اس خطے میں اپنی موجودگی کو منظم اور طاقتور بنایا جائے۔

ورکرز پارٹی پاکستان بیرونی مداخلت کی شدید مذمت کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ بیرونی مداخلت فوری بند کی جائے۔ پارٹی لیبیا کے عوام کی جمہوری جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ معمر قذافی فوری طور پر اقتدار سے علیحدہ ہو جائے اور اختیارات عوام کے نمائندے کے حوالے کر دے۔

☆☆☆☆☆

قومی سلامتی کی ریاست: کیوں، کس کے لیے اور کب تک؟

مسئلہ ریمنڈ ڈیوس نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں فیصلہ سازی کا عمل خفیہ اور غیر جمہوری ہے۔ جبکہ ردعمل بھی کچھ اس طرح ہے کہ رجعتی قوتیں صرف اور صرف نعرہ بازی تک محدود ہیں اور ترقی پسند حلقے کنفیوژن کا شکار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ریمنڈ ڈیوس سمیت پچھلے عرصہ میں کئی ایسے واقعے ہوئے ہیں جن پر بائیں بازو کو قومی سلامتی کی ریاست اور اس کی وجہ سے سماج میں پیدا ہونے والا انتشار پر اپنا واضح نکتہ نظر بیان کرنا چاہیے تھا۔

جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے ریاستی حلقے ''نظریہ پاکستان'' کے نام پر عوام پر اس آڑ میں مسلط رہے ہیں کہ (مسلمان) پاکستان کو (ہندو) بھارت سے خطرہ ہے۔ اگر مشرق میں بھارت کو سب سے بڑا دشمن تصور کیا گیا تو مغرب میں افغانستان کو بھی ہمیشہ سے ایک مشکوک ریاست کے طور پیش کیا گیا جو کہ پاکستان میں رہنے والے پشتونوں میں علیحدگی پسند خیالات پھیلانے میں مصروف رہا ہے۔ یعنی کہ ہمارے دونوں اطراف دشمن ہیں چنانچہ نہ صرف فوج پر بجٹ کا بڑا حصہ خرچ کرنا ضروری ہے بلکہ بیرونی امداد کو بھی بھارت سے مقابلہ کرنے کے لیے لیا جانا چاہیے۔ اس منطق نے آخر فوج کو سیاست میں بھی مداخلت کا جواز فراہم کیا اور آج پاکستان کے بننے کے 63 سال بعد ہمارے ہاں مین سٹریم کی سیاسی جماعتیں فوجی اسٹیبلشمنٹ کی بی ٹیم بن کر رہ گئی ہیں جبکہ مجموعی طور پر سیاست کا طرز انتہائی عوام دشمن ہو گیا ہے۔

افسوس کہ نظریہ قومی سلامتی پر آج تک نظر ثانی نہیں ہوئی۔ 1971 میں مشرقی پاکستان کا علیحدہ اور بنگلہ دیش کا وجود میں آنا ہماری کتابوں میں ہندوؤں کی سازش قرار دیا گیا۔ اس کے بعد سے پاکستان کے اندر پیدا ہونے والے لسانی اور دیگر تضادات کو بھی ''بیرونی ہاتھ'' کا کام قرار دیا جس کی وجہ سے سماج کے اندر سے پھوٹنے والے یہ مسائل وقت کے ساتھ ساتھ اور زیادہ گھمبیر ہوتے چلے گئے۔ آج بلوچستان میں علیحدگی پسند سیاست عروج پر ہے جبکہ فاٹا اور پختونخواہ میں مذہبی قوتیں عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں۔ پنجاب اور بڑے شہر بھی اب محفوظ نہیں ہیں لیکن جب بھی کہیں خودکش دھماکہ ہوتا ہے تو سرکار اپنی تاریخی پالیسوں پر نظر ثانی کرنے کے بجائے بیرونی سازش کا دعوی کرنے میں دیر نہیں کرتی۔

اس ساری کنفیوژن کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں میڈیا کا بہت بڑا رول ہے۔ اگرچہ لمبے عرصہ تک سرکاری میڈیا نے ''نظریہ پاکستان'' کا پرچار کیا چند سالوں سے نجی ٹی وی میڈیا نے زیادہ بہتر کردار ادا نہیں کیا۔ ٹی وی اینکروں نے امریکہ کے حوالے سے بہت زیادہ رجعتی نکتہ نظر اپنایا ہوا ہے۔ مذہبی جماعتیں اور میڈیا دونوں ہر تشدد کے واقع کے بعد امریکہ پر ہی الزام لگاتے ہیں اور مجموعی طور پر ''اسلام'' اور ''مغرب'' کے درمیان ناقابل حل تضاد کو ابھارتے ہیں۔ ایسا کر کے یہ حلقے پاکستانی ریاست کی اصلیت اور پاکستانی سماج میں حقیقی طبقاتی، قومی اور دیگر تضادات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ہر چھوٹے موٹے مسئلہ کو امریکی سازش قرار دے کر میڈیا سامراج کے تاریخی کردار کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ دراصل سامراجی حکمت عملی ہماری فوجی اسٹیبلشمنٹ کی بالادستی کا بہت بڑا سبب ہے۔ اسی طرح امریکہ کا ماضی اور حال میں کردار مذہبی انتہاء پسندی کو بھی ہوا دیتا ہے، اور قومی سلامتی کی ریاست کو تقویت۔

بدقسمتی سے ترقی پسند حلقوں نے اس ساری صورت حال میں نہ درست تجزیہ اور نہ ہی سیاسی خلا پورا کیا ہے۔ لبرل پوزیشن کچھ اس طرح کی رہی ہے کہ فوجی اسٹیبلشمنٹ کو ''دہشت گردوں'' کو بطور طاقت ختم کرنے کے لیے باور کیا گیا ہے۔ اس طرح امریکہ کی نام نہاد ''دہشت گردی کیخلاف جنگ'' کو پاکستان میں پھیلانے کے لیے جواز پیدا کیا گیا ہے۔ آج سمجھنے کی ضرورت یہ ہے کہ اس جنگ کو شروع ہوئے 10 سال بعد مذہبی انتہاء پسندی بڑھ رہی ہے، ریاستی اداروں نے اسلام کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی پالیسی قطعاً نہیں بدلی، بلوچستان میں حالات بہت سنگین نوعیت کے ہو چکے ہیں اور سماج میں طبقات اور دیگر اقسام کا جبر شدید سے شدید تر ہوا ہے۔

آج ناگزیر ہو گیا ہے کہ پاکستان میں بنیادی سیاسی، معاشی و ثقافتی تضادات کو گہرائی سے سمجھا جائے اور ایک ایسی حکمت عملی تشکیل دی جائے جس سے حقیقی معنوں میں سامراج، رجعتی قوتوں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے تسلط سے محنت کش عوام کو چھٹکارہ دلوایا جائے۔ اس سلسلے میں ورکرز پارٹی پاکستان اسلام آباد سے ابتداء کرتے ہوئے پورے ملک میں بحث و مباحثے منعقد کر رہی ہے جن کا مقصد ترقی پسند حلقوں میں ان اہم مسائل پر اتفاق رائے قائم کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

عوامی مسائل، سماجی تبدیلی اور سیاسی جماعتوں کا کردار

مقتدا منصور

اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا پاکستان میں کسی تبدیلی کا امکان ہے یا نہیں۔ جہاں تک تبدیلی کا تعلق ہے تو ہر معاشرہ کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے ہر دور میں تبدیلی کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ مگر پاکستان کا معاملہ خاصا مختلف ہے، کیونکہ یہ ملک اور معاشرہ تیزی کے ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشی تنزلی کے راستے پر گامزن ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ فکری تضادات اور ثقافتی انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اسے نہ صرف بعض بیرونی خطرات کا سامنا ہے بلکہ اندرونی سماجی خلفشار اور فکری تقسیم بھی ایک بہت بڑے خطرے کے طور پر سامنے آ رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی شدت پسند قوتیں، جو ایک مخصوص مسلکی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں، ریاستی پالیسی سازی پر اثر انداز ہونے کے علاوہ ملک کے سیاسی و سماجی منظر نامہ کو حسب خواہش تبدیل کرنے کی پوزیشن میں آ چکی ہیں۔ اسکی ایک وجہ مقبول عوامی ووٹ حاصل کرنے والی سیاسی جماعتوں کی منافقانہ روش اور دوہری پالیسیاں ہیں۔ یہ جماعتیں اپنے فکری انتشار و اضمحلال اور موروثی سیاسی کلچر کے باعث ملک کو مسائل و مصائب سے نکالنے کے لئے ٹھوس حکمت عملی اور جامع لائحہ عمل تیار کر کے اسے عوامی قبولیت دلوانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اس صورتحال کے کئی بنیادی اسباب ہیں لیکن سب سے اہم سبب سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے ادارہ جاتی مفادات ہیں، جو عوام کی مذہب سے دلی وابستگی کو سماجی پسماندگی برقرار رکھنے اور ہندو دشمنی کو بڑھاوا دینے کے لئے مسلسل استعمال کر رہی ہیں۔ اس کی اس کوشش کو فیوڈل سیاسی قیادتیں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم مذہبی جماعتیں توانائی بخشتی ہیں اور ملک میں سیاسی و سماجی جمود و برقرار اور ہندوستان کے ساتھ مخاصمت اور تناؤ کو جاری رکھنے میں معاونت کرتی ہیں۔ پاکستان آج 64 برس گزر جانے کے باوجود اسی فکری کشمکش اور ریاست کے منطقی جواز کی مبہم اور غیر واضح تفہیم کا شکار ہے، جس کا آغاز 1949ء میں قرار داد مقاصد کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ حالانکہ بانیان پاکستان خاص طور پر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے قیام پاکستان کے سرکاری اعلان سے تین روز قبل ہی آل انڈیا ریڈیو اور پھر دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے نئے ملک کے سیاسی و انتظامی خدوخال کی وضاحت کر دی تھی۔ مگر سیاستدانوں کے ایک مخصوص طبقے نے بیوروکریسی کے ساتھ ساز باز کر کے قائداعظم کی آنکھ بند ہوتے ہی اس ملک کی بنیادی اساس پر شب خون مارا اور اسے ان کی خواہشات کے برخلاف تھیوکریٹک ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے سازشوں کا آغاز کر دیا۔

پاکستان کے متوسط حلقے اس ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی اور جمہوری اقدار کے فروغ پر طویل بحث و مباحثے اور نظم حکمرانی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ مگر ریاست کے منطقی جواز میں موجود ابہام پر مکالمہ سے گریز کی پالیسی اختیار کر کے دراصل ریاستی ڈھانچے میں موجود خامیوں کی نشاندہی کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے سیاسی و سماجی ڈھانچے پر غالب جمود برقرار رہے اور 64 برس گزر جانے کے باوجود اس ملک کی سمت کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس صورتحال کو سلجھانے کے لئے اول تو ہمیں اس واہمہ (myth) سے نکلنا ہوگا کہ بانیان پاکستان اس ملک کو تھیوکریٹک ریاست یا اسلام کا قلعہ یا پھر اسی نوعیت کی کوئی چیز بنانے کے خواہشمند تھے۔ دوئم یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ 1947ء میں جو بھی نظریہ تقسیم ہند کا سبب بنا تھا وہ 16 دسمبر 1971ء خلیج بنگال میں غرقاب ہو گیا۔ لیکن باقی ماندہ ملک جو آج پاکستان کہلاتا ہے صرف اس خطے میں آباد قوموں کے ایک وفاق کے طور پر اپنا منطقی جواز رکھتا ہے کیونکہ 64 برسوں کے دوران اس خطے میں آباد قوموں، لسانی اکائیوں اور مختلف سماجی گروہوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی رشتے قائم ہو چکے ہیں اور ایک نئی عمرانی ترتیب تشکیل پا چکی ہے۔ جس کے لئے ایک از سر نو عمرانی معاہدے کی ضرورت ہے۔ اس عمرانی معاہدے کی تشکیل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس ملک کی فوجی اسٹیبلشمنٹ اور فیوڈل ذہنیت کے حامل سیاسی قیادت اور مذہبی قوتیں ہیں۔

اس کے علاوہ علاقائی اور عالمی سیاست کے حوالے سے بھی پاکستان اس خطے میں مضبوط تزویراتی حیثیت کا حامل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کے وجود یا اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ مسئلہ صرف اس ریاست کے منطقی جواز کو صحیح سمت دے کر منزل کا تعین ہے، جس کے بغیر اب قومی سلامتی کے مسائل کو حل کرنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ بعض دانشوروں اور سیاسی راہنماؤں کا یہ جائزہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد اگر مسٹر بھٹو مرحوم، میر غوث بخش بزنجو اور ولی خان مرحوم کے علاوہ معروف قانون دان اور سماجی دانشور بیرسٹر کمال فاروقی مرحوم کی اس دلیل کو تسلیم کر لیتے کہ آئین کی تشکیل کے ساتھ باقی ماندہ ملک کے لئے ایک نیا عمرانی معاہدہ بھی ترتیب دیا جائے، تو پاکستان ان مسائل کا شکار نہ ہوتا، جن میں آج مبتلاء ہے۔ اس طرح پاکستان ایک حقیقی وفاقی جمہوریہ بن جاتا، جس میں تمام قوموں کے مساوی حقوق ہوتے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے اردو اور گجراتی بولنے والوں کے لئے مقامی قوموں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت تک ان کے بھی اس نئی ریاست میں stake بن چکے تھے۔ اور سماجی تعلق گہرا ہو رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کے ساتھ پیدا ہونے والی مخاصمت میں بھی کمی واقع ہونے سے خطے میں پائیدار امن کے قیام میں مدد مل سکتی تھی۔ جو اس خطے میں معاشی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن پاکستان کے منطقی جواز کو Redefine کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ سول اور ملٹری بیوروکریسی کے علاوہ خود فیوڈل سیاستدان بھی ہیں جو 63 برس سے کسی نہ کسی شکل میں اس ملک کے اقتدار اعلیٰ اور قومی وسائل پر قابض چلے آ رہے ہیں۔ یہ تینوں عناصر چونکہ اپنے ادارہ جاتی اور طبقاتی مفاد کی خاطر مضبوط مرکز کے حامی ہیں اسلئے عملاً صوبائی خودمختاری اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کے مخالف ہیں۔ جبکہ مذہب کے نام پر عوام کو زیادہ آسانی کے ساتھ سماجی طور پر پسماندہ رکھا جا سکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت نے 1972ء میں ایک نئے عمرانی معاہدہ کی تشکیل سے گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے

صرف آئین سازی پر توجہ دی اور آئین بن جانے کے فوراً بعد بلوچستان میں فوج کشی کر کے دراصل اسٹیبلشمنٹ کے پرانے ایجنڈے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

مسٹر بھٹو نے جنہیں پاکستان کی تعمیر نو کا موقع ملا تھا تین فاش غلطیاں کر کے نہ صرف ملک کے منطقی جواز کے مسئلے کو حل کرنے سے گریز کیا بلکہ اپنی زندگی بھی گنوائی۔ ان میں پہلی غلطی اسٹیبلشمنٹ کے کہنے پر بلا جواز بلوچستان پر فوج کشی تھی۔ دوسری جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دے کر اس ملک میں نہ صرف متشدد فرقہ وارانہ آویزش کا راستہ کھولا، بلکہ ایک مخصوص مسلک کو سیاسی قوت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جو آج مقبول ووٹ بنک نہ رکھنے کے باوجود پالیسی سازی پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں آ چکا ہے۔ تیسرے فوج میں کئی ڈویژن کا اضافہ کر کے اسے نئی توانائی دی اور سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں اسے جو دھچکا لگا تھا اس کی تلافی کر کے اسے ایک بار پھر مضبوط ہونے اور پالیسی سازی پر اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ جس نے خود انہی کا تختہ الٹ کر ملک میں بنیاد پرستی اور شدت پسندی کو مزید مستحکم کیا۔ مسٹر بھٹو کی یہ تینوں غلطیاں نہ صرف ان کے اقتدار اور زندگی کے لئے مہلک ثابت ہوئیں۔ بلکہ ان کی وجہ سے باقی ماندہ پاکستان ایک حقیقی وفاقی جمہوریہ بننے کا راستہ بھی مسدود ہو گیا اور یہ ملک ایک خطرناک تھیوکریٹک ریاست میں تبدیل ہو گئی۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس وقت جبکہ بلوچستان آتش فشاں بنا ہوا ہے، سندھی عوام بھی وسائل کی تقسیم کے حوالے سے تحفظات رکھتے ہیں، پورے ملک میں مذہبی شدت پسندی ایک عفریت کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ریاستی ادارے تباہی کے دہانے پر پہنچ رہے ہیں تو کیا ایک نئے عمرانی معاہدے کی تشکیل کے ذریعہ ان مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف اندرون ملک جنم لینے والا سیاسی و سماجی خلفشار ہی نہیں بلکہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمی سیاسی رجحانات اور 9/11 کے بعد خطے کی تزویراتی صورتحال میں جس تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی ہے، وہ پاکستان کی بقاء و سلامتی کے لئے ایک نئے عمرانی معاہدے کی تشکیل کی متقاضی ضرور ہے مگر ممکن نظر نہیں آ رہا۔ کیونکہ وہ جمودی قوتیں جو 73-1972ء کے دوران خاصی کمزور اور منتشر تھیں، مگر آج یہ بہت زیادہ طاقتور اور توانا ہو چکی ہیں۔ اور ان میں ریاستی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ نیا عمرانی معاہدہ دراصل ریاست کے منطقی جواز کو redefine کئے بغیر ممکن نہیں ہو گا۔ جس کی نہ تو مستقل اسٹیبلشمنٹ اجازت دے گی اور نہ ہی دیگر سیاسی قوتیں بالخصوص مذہبی جماعتیں اس پر آمادہ ہوں گی جن کی سیاست کا محور ہی ریاست کی مذہبی تشریحات سے مشروط ہے۔ اس تناظر میں اس پہلو کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جو قوتیں ایک فوجداری قانون کی ایک شق میں تبدیلی پر طوفان کھڑا کر کے قومی سیاسی جماعتوں کو ترمیمی بل واپس لینے پر مجبور کر سکتی ہیں وہ کس طرح نئے عمرانی معاہدے کو ہضم کر سکیں گی۔

ایک اور پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کی طرح آئین توڑنے کی بجائے اسے کچھ عرصہ معلق رکھ کر اس میں من مانی تبدیلیاں اس لئے کی تھیں کہ ان دونوں آمروں کو یہ اندازہ تھا کہ تبدیل شدہ عالمی اور اندرونی حالات کے تناظر میں نئے آئین کی تیاری کا ایڈونچر پورے ریاستی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر دے گا۔ لیکن اپنے اہداف کے حصول کے لئے ان دونوں آمروں نے آئین کو تختہ مشق بنا کر اس میں بعض ایسی تبدیلیاں کر دیں جو کسی بھی طور پر ایک پارلیمانی جمہوری ریاست کا خاصہ نہیں ہوتیں۔ گو کہ موجودہ پارلیمنٹ نے اٹھارویں اور انیسویں ترامیم کے ذریعہ کچھ خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن آج بھی اس میں بعض ایسی خامیاں اور نقائص رہ گئے ہیں جو حقیقی جمہوری نظام حکمرانی کے تسلسل کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ اس لئے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں بہتری کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ 1973ء کے آئین کو جاری رکھتے ہوئے اس میں پارلیمنٹ کے ذریعہ مزید ترامیم کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر توجہ دی جائے، جیسا کہ اٹھارویں اور انیسویں ترامیم کے ذریعہ دور آمریت میں پیدا کردہ بگاڑ پر خاصی حد تک قابو پایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض حلقوں کی یہ رائے ہے کہ ترقی پسندی کی دعویدار سیاسی جماعتوں، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور ذرائع ابلاغ بُری منتخب حکومت کو اچھی آمریت پر ترجیح دینے کے لئے عملاً تیار ہو جائیں اور جمہوری عمل کے تسلسل میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے اسے مستحکم کرنے، اقتدار واختیار کو زیادہ سے زیادہ نچلی سطح پر منتقل کرنے، پالیسی سازی میں شفافیت لانے اور فعال احتساب کے لئے پیروی (Advocacy) کا راستہ اختیار کریں تو سیاسی اور انتظامی نظام میں بہتری کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

مگر موجودہ سیاسی سیٹ اپ جس میں شامل جماعتیں فوجی اسٹیبلشمنٹ کے مفاد میں پیدا کردہ status quo کو جاری رکھنے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں جمہوریت محض دکھاوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ ریاست کے تین اہم شعبے یعنی مالیاتی منصوبہ بندی، خارجہ پالیسی اور دفاعی امور ہنوز جی ایچ کیو کی مرضی سے طے ہوتے ہیں۔ ان امور پر پارلیمان میں کھل کر بحث کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا ان شعبہ جات کے منتخب نمائندوں کی دسترس میں نہ ہونے کی وجہ سے ترقیاتی منصوبہ بندی کے لئے مناسب رقم دستیاب نہیں ہوتی اور بجٹ کا بیشتر حصہ فوجی ضروریات پر صرف ہوتا ہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مقبول سیاسی جماعتوں میں پائی جانے والی موروثیت اور فیوڈل کلچر ہے ہے۔ اس لئے یہ جماعتیں خود بھی عوامی مسائل کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ یہ جماعتیں ہر بار اس لئے ایوانوں میں پہنچتی ہیں کیونکہ آج بھی دیہی معاشرت سخت گیر جاگیردارانہ اور قبائلی کلچر کی گرفت میں ہے۔ جبکہ شہروں پر مختلف مافیاؤں کی مضبوط گرفت ہے یا پھر برادری نظام کا تسلط قائم ہے۔ جو اہل، مخلص اور صاحب بصیرت سیاسی کارکنوں کے ایوانوں تک پہنچنے کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس لئے موجودہ سیاسی status quo کے خاتمے کے بہت کم امکانات ہیں۔ البتہ اگر عوامی دباؤ کے تحت ایک آزاد اور ادارہ جاتی طور پر خود مختار الیکشن کمیشن تشکیل پا جاتا ہے اور میڈیا ہاؤسز حقیقی عوامی مسائل کو منظر عام پر لانے پر آمادہ یا مجبور ہو جاتے ہیں تو ترقی پسند، دوست سیاسی جماعتوں کے ایوانوں تک پہنچنے اور سیاسی و سماجی منظر نامہ میں کسی حد تک تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن جو صورتحال جاری ہے، اس میں فوج کے ایک بار پھر اقتدار پر قابض ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں اور شاید اقتدار میں شامل جماعتیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ فوج جس قدر جلد ممکن ہو اقتدار پر قابض ہو جائے تا کہ انہیں مظلوم بن کر ایک بار پھر عوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔

عالمی سٹہ باز مالیاتی انہدام کے بعد

فوڈ کی سٹہ بازی کے ذریعے بہتات میں قلت پیدا کرنے میں مشغول

نجم الحسن عطا

فرانس کی خانہ جنگی کے موضوع پر کارل مارکس کی 150 سالہ پرانی تحریر پاکستان کے موجودہ حالات پر اس طرح صادق آتی ہے جیسے انہوں نے یہ تحریر پاکستان میں بیٹھ کر لکھی ہو۔ اسی لئے کارل مارکس کی تحریریں ابدی افادیت کی حامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جمہوریت کی اس پُر انتشار حاکمیت کے کھیل میں جبر کی مختلف شکلیں مجتمع ہوگئی ہیں۔ حکمران طبقات کے مختلف گروہ استحصال کی ان اقسام کو بے دردی سے استعمال کرتے ہوئے اپنی اپنی غداریوں کا بدمست جشن منا رہے ہیں۔ ایک بے ہودہ دیدہ دلیری کے ساتھ وہ اپنی ماضی کے پیشوں اور کرداروں کے منکر ہو کر تمام نام نہاد اصولوں کو پیروں تلے روندتے ہوئے انقلاب کا نام لے کر انقلاب کو گالی دے رہے ہیں۔ ایسی حاکمیت کا کھیل انہیں عوام کے خلاف اپنی مشترکہ جارحیت اور ظلم کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ گویہ اقتداء وانتہائی سفاک ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ طبقاتی حکمرانی کی بدترین غلیظ، خوفناک اور نفرت انگیز شکل میں ہے۔''

مذکورہ بالا حوالہ صرف پاکستان پر ہی نہیں پوری دنیا کی جعلی جمہوریت پر صادق آتا ہے جو اب عالمی مالیاتی انہدام اور خوراک اور فوڈ کموڈیٹی پر سٹہ کھیل کر خوراک کی ایسی قلت پیدا کرنے کے درپے ہے جس سے غریب دنیا تباہ ہو جائے گی۔ یوں قدرتی وسائل کی بہتات میں قلت پیدا کر کے منافع خوری کو بڑھایا جا رہا ہے۔ ڈالر کی موت (Demise of the Dollar) کے مصنفین ایڈیسن وگن اور جے مائیکل پائنز کی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس نے امریکہ کے سامراجی عزائم اور ڈالر کے روبہ زوال ہونے کے چونکا دینے والے حقائق بیان کرتی ہے۔ سرمایہ داریت کے بدترین بحران کے حوالے سے مذکورہ کتاب میں ایک جگہ مصنفین رقم طراز ہیں:

''ستمبر 2008 کو سرمایہ دارانہ نظام کا بدترین بحران سامنے آیا۔ جب امریکہ کے دوسرے بڑے بنک لیہمن برادرز (Lheman Brothers) کا خسارہ قابل برداشت حدود کو پار کر گیا۔ نیویارک اسٹاک مارکیٹ میں ایک شیئر کی قیمت 80 ڈالر سے گر کر 1.25 ڈالر پر آ گئی۔ یعنی اس بنک کے سرمایہ کی مالیت 185 ارب ڈالر سے گر کر 5.5 ارب ڈالر رہ گئی اور لیہمن برادرز کے 130 ملکوں میں پھیلے ہوئے 16 ہزار ملازمین کی نوکریاں خطرے میں پڑ گئیں۔ اسی دن 15 ستمبر 2008 کو امریکہ کی بین الاقوامی شہرت کی حامل انشورنس کمپنی اے آئی جی A.I.G. کریش کر گئی۔ اور اس نے اپنی بقا کے لئے امریکی حکومت سے 85 ارب ڈالر کا مطالبہ کر دیا۔''

یہ تو مالیاتی انہدام کی ایک معمولی جھلک ہے جس کے بعد نجی شعبے میں سٹہ بازی اور دھوکہ بازی نے دنیا کے صارف کو بھکاری تو بنا دیا خود نجی شعبہ جو حکومت کی مداخلت کے خلاف تھا حکومت سے عوام کے ٹیکسوں سے آمدن پر بیل آؤٹ پیکج کا مطالبہ کر رہا تھا۔ دوسری جانب عالمی ساہوکاروں اور ہیج فنڈوں نے کرنسی کو چھوڑ کر فوڈ کموڈیٹی میں سٹہ بازی شروع کر دی۔ مذکورہ بنک لیہمن برادرز نے اس سٹہ بازی سے ایک ارب ڈالر کما لئے جس سے دنیا میں خوراک کی قیمتوں میں 70 فیصد اضافہ ہو گیا۔ 2007ء کے خوراک کے بحران نے مکئی کی قیمتوں میں دگنا، گندم میں 50 فیصد اور چاولوں کی قیمت میں 70 فیصد اضافہ کر دیا۔ اس پر لندن اکنامسٹ نے لکھا کہ ''خوراک پر سٹہ بازی کے نتیجے میں 1845ء کے بعد افراط زر کی شرح تاریخی نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔'' اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نصابی کتابوں کی معاشیات بے کار ثابت ہوئی چنانچہ قیمتوں کا تعین رسد اور طلب (منڈی کی قوتیں) سے نہیں ہوتا یہ بہتات میں قلت پیدا کرنے کے لئے اسٹاک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس طرح مصنوعی قیمتوں کو بڑھا کر بیٹھے بٹھائے سٹہ بازی کے ذریعے اربوں ڈالر کما لئے جاتے ہیں۔ عالمی اور مقامی سطح پر مشاہدہ کیا جائے تو خوراک کی قیمتوں میں اضافہ رکا نہیں بلکہ گندم اور دیگر اجناس کی قیمتوں میں گزشتہ برس اضافہ ہوا جس کے ضارب اثرات تمام معیشتوں پر مرتب ہوئے جس سے عالمی سطح پر غریبوں کی دنیا مزید اجڑ گئی اور درمیانے طبقے کی قوت خرید میں مزید کمی آئی۔ ڈاکٹر عارف آزاد ایک موقر انگریزی اخبار میں قیمتوں کے ساز باز کے عنوان سے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''طلب اور رسد کی مبادیات کے تناظر میں فوڈ بحران کے ضمن میں سوالیہ نشان ہے بحران کے اسباب کہیں اور ہیں۔'' کہیں اور سے ان کا مطلب سٹہ بازی ہے۔ انہوں نے اپنی اس دلیل کے حق میں یہ بھی لکھا کہ ہم کس طرح اپریل 2007 سے اپریل 2008 کے درمیانی عرصے میں چاولوں کی 165 فیصد قیمتوں کے اضافے کی کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ سارا کھیل سٹہ بازی اور مصنوعی قیمتوں کا ہے۔ پھر اس کا جواز یوں بھی نہیں ہے کہ عالمی سطح پر چاولوں کا اسٹاک بھی کم نہیں تھا۔ یعنی چاولوں کے حجم میں کمی نہیں آئی اور پھر بھی سٹہ بازی کے ذریعے بے تحاشہ قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا۔

دنیا بھر کے معیشت دان دیکھ رہے ہیں اور کچھ لکھ بھی رہے ہیں کہ ملٹی نیشنلز، عالمی سٹہ باز، ہیج فنڈز، عالمی سطح کے بڑے بڑے بنک کموڈیٹی اسٹاک مارکیٹ سٹہ بازی کے ذریعے عالمی قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں جس میں سونا اور پیٹرول بھی شامل ہے۔ ہندوستان کے ایک معروف معیشت دان جیوتی گھوش ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''عالمی مالیاتی انہدام اور ہاؤسنگ سٹہ بازی کا دیوالیہ ہونے کے بعد شکاری ساہوکار، ہیج فنڈز اور بڑے بنک زرعی اشیاء کی سٹہ بازی میں مصروف ہو

گئے ہیں۔ جو دنیا کو قحط سے دوچار کر دیں گے۔'' اس بات کو تیکنیکی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ 2002 سے 2008 تک کموڈیٹی (Derivatives) ڈیریویٹوز میں 500 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ عرصہ میں قیمتوں کے ساز باز اور سٹہ بازی سے 500 فیصد اضافہ ہوا ہے جو بالکل مصنوعی ہے۔

اینٹی پاورٹی آرگنائزیشن کے مطابق ایک اور سٹہ باز بنک گولڈ مین بنک نے 2009 میں فوڈ کی سٹہ بازی کے نتیجے میں سوا ارب ڈالر کمالئے۔ لہٰذا اس بات کا جائزہ لینا اور توجہ دینا عالمی سیاسی پارٹیوں، سول سوسائیٹیز اور دانشوروں کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ اس عالمی جوئے سے دنیا کے غریبوں کو انتہائی استحصال کے ذریعے جس خوفناک غربت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس استحصال کو کیسے روکا جائے۔

خوراک پر سٹہ بازی کے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق انتہائی غربت میں 20 کروڑ نفوس کا اضافہ ہوگا۔ اس سے افزوں یہ کہ پاکستان میں بیڈ گورننس، لوٹ مار اور ریگولیٹری نظام نہ ہونے کی وجہ سے خطرناک صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک طرف بجلی کا بحران صنعتوں اور معیشت کو تباہ کر رہا ہے، بے روزگاری اور مہنگائی سنگین صورت اختیار کر رہی ہے اور پھر پی ایس او (PSO) کو اگر 151 ارب روپے نہ ملے تو تیل کی ترسیل بند ہونے سے ملک مکمل طور پر دیوالیہ ہو سکتا ہے۔ لیکن حکمران طبقے فوج سمیت امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں کو راضی کرنے میں مشغول ہیں جبکہ ملکی اور غیر ملکی قرضے عروج پر ہیں ادارے انتہائی خسارے کا شکار ہیں۔

ہندوستان کی ترقی کے گیت بھی بہت گائے جاتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی مڈل کلاس 35 کروڑ تک پہنچ چکی ہے لیکن ہندوستان کی ادیبہ اور معروف سماجی رہنماء ارون دھتی رائے نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان میں گزشتہ ایک عشرے میں بھوک، ننگ، بیماری اور قرضوں سے تنگ آ کر ایک لاکھ انسانوں نے خودکشی کر لی ہے۔'' یہ حالت زار تو کارپوریٹ بھارت کی ہے۔ اسی طرح خوراک کی مہنگائی اور بے روزگاری کیوجہ سے پاکستان اور دیگر غریب ملکوں میں خودکشی کا تناسب، بند دماغ اور بے عمل، بے حس لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ پاکستان جہاں خوراک پر آمدنی کا 60 فیصد خرچ کیا جا رہا ہے وہاں صحت کا شعبہ خود اس قدر بیمار ہے کہ اس کی شفاء کے لئے کوئی سیاسی و معاشی نسخہ موجودہ قیادت کے پاس نہیں ہے۔

دوسری جانب مہنگائی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی خوراک کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ 70 فیصد آبادی کم خوراکی کا شکار ہے۔ اس کیوجہ یہ ہے کہ ڈیری پروڈکٹ کی برآمد اور اسمگلنگ جاری ہے اور بیرونی ملکوں کی کمپنیوں کو پھل اور دودھ فروخت کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ برس دو لاکھ جانور اسمگلنگ یا برآمد ہوئے۔ پاکستان کے غریب علاقوں میں گندے پانی اور خوراک کی شدید کمی سے مہلک بیماریاں پھیل رہی ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ سیلاب کے بعد فوڈ سیکورٹی کا مسئلہ خطرناک صورتحال اختیار کر گیا ہے۔ اس کے باوجود ملک میں گندم اور شکر کے کارٹیلز بنتے ہیں اور عوام کو لوٹتے ہیں۔ یہ بھی اندازہ کیجئے کہ فوری خراب ہونے والی اشیاء کی قیمتوں میں 2010 میں اضافہ 17.27 فیصد تھا جو 2011 میں بڑھ کر 44.5 فیصد ہو گیا ہے۔ میڈیکل اور ٹرانسپورٹ میں بالترتیب اس سال 16 اور 13 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ غریب آدمی کا بسوں میں سفر کرنا محال ہو گیا ہے۔

دوسری طرف عالمی سطح پر خوراک پر سٹہ بازی جاری ہے اور ملک میں معاشی منصوبہ بندی کے بارے میں کسی سیاسی پارٹی کو تشویش نہیں ہے ان کی شور وغل میں غریب کی آواز گم ہو گئی ہے۔

سٹہ بازی کی نئی شکل، سامراجی سرمائے کے درآمدی استحصال کے خلاف مینوفیکچرنگ میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کی زد سامراجی برآمدات پر پڑتی ہے اس لئے غریب ملکوں کو کسی صورت پاؤں پر کھڑے نہیں ہونے دینا یہ عالمی سرمایہ دار قوتوں کا نصب العین ہے۔

عالمی سرمایہ داروں کے صنعتی سامراج (ملٹی نیشنلز) کو خطرہ لاحق ہے کہ ان کے مشینی سرمائے کی برآمدات روکنے سے ان کی برتری کا ڈھانچہ منجمد ہو کر زوال پذیر ہو جائے گا آج بھی امریکا انتہائی پیداوار اس لئے کر رہا ہے کہ وہ برآمدات کے ذریعے اپنا توازن ادائیگی درست کرے۔ چنانچہ سرد جنگ کے فاتح سامراج نے واشنگٹن اتحاد کے بعد عالمی بنک آئی ایم ایف سٹرکچرل ایڈجسمنٹ، عالمی تجارتی تنظیم اور ملٹی نیشنلز کے حربے استعمال کرتے ہوئے منڈیوں کو آزاد کروانے کے لئے محصولات سے آزادی، سرمائے کی آزاد آمدورفت، آزاد مقابلے، نج کاری، ڈی ریگولیشن اور ڈی کنٹرول کی شرائط کو نئے نظام کا حصہ بنالیا اس سارے عمل کا پیش منظر یہ تھا کہ سرمائے کی آزاد ٹریفک سے تجارت کے عالمی حجم میں اضافہ گریگا لیکن نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے فوراً بعد نتائج اس کے بعد بالکل الٹ برآمد ہونا شروع ہو گئے اور سٹہ بازی نے مالیاتی انہدام سے دوچار کر دیا اور اب خوراک کی سٹہ بازی قحط کو خوش آمدید کہہ رہ ہے اس بارے میں بہت عرصہ پہلے سائنس ،ٹیکنالوجی اور معیشت کے ماہر اکبر علی ایم اے نے اپنے ایک خوبصورت مضمون میں لکھا ''حالات وواقعات نے ثابت کر دیا کہ سرمائے کا سائنسی اور معاشی ارتقاء جس مرحلے پر پہنچ چکا ہے اس میں سوشلزم کی شراکت کے بغیر دنیا میں سرمائے کی تخلیق کا نظام منصفانہ نہیں ہو سکتا اور سرمائے کی تخلیق کا نظام منہی برانصاف نہ ہو تو جمہوریت ،لبرازم شہری آزادیاں اور انسانی حقوق کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔

☆☆☆☆☆

پناہ لیتا ہے جن مجلسوں میں تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں
(ساحر لدھیانوی)

پروفیسر احمد علی اور ترقی پسند تحریک

مسلم شمیم

پروفیسر احمد علی علم وادب، فلسفے، تاریخ، مذہب، تصوف اور کلچر کے حوالے سے ایک بڑا نام ہیں۔ اُن کی کثیر الجہت شخصیت کا ہر پہلو جامعیت کا حامل ہے۔ وہ ایک نابغہ روزگار تھے اور ان کے creative genius کا اظہار اردو افسانوں کے چار مجموعوں اور 'دہلی کی شام' کے علاوہ 1940ء سے 1993ء میں ان کی وفات تک انگریزی میں ان کی شائع ہونے والی اٹھارہ کتابوں کے ذریعے ہوا ہے۔ ان کی شائع ہونے والی اٹھارہ کتابوں میں تین ناول 'Twilight in Delhi' 'Ocean of Night' 'Of rats and Diplomats'، نظموں کے دو مجموعے 'The First Voice'، 'Purpose Gold Mountain' ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ 'Mr. Eliots Penny World of Dreams' غالبؔ کے منتخب فارسی کلام کا منظوم انگریزی ترجمہ 'The Lamp of the Temple' اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اردو شاعری کے انتخاب کا منظوم انگریزی ترجمہ 'The Golden Tradition'، غالبؔ کے فن پر ایک کتاب 'Style and Technique in Ghalib' اور قرآنِ مجید کا نیا انگریزی ترجمہ شامل ہیں۔ اس عظیم شخصیت کے صد سالہ یومِ پیدائش کے موقع پر گزشتہ سال یعنی 2010ء میں انجمنِ ترقی اردو پاکستان نے جامعۂ پنجاب سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران کی کتاب 'پروفیسر احمد علی ۔ حیات اور ادبی خدمات' شائع کر کے ایک تاریخی قرض ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں ادبی دنیا کی بے اعتنائی پر اظہارِ افسوس کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔

احمد علی یکم جولائی 1910ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ہائی سکول سے 1925ء میں اور انٹر سائنس یونیورسٹی سے 1927ء میں پاس کیا۔ 1928ء میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور 1931ء میں ایم۔اے۔ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ 1931 اور 1932ء میں اور پھر 1936ء سے 1941ء تک وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ 1933ء سے 1935ء تک کی درمیانی مدت میں پہلے دو سال الہ آباد یونیورسٹی میں اور پھر آگرہ کالج میں انگریزی کے استاد رہے۔ 1942ء سے 1944ء تک انہوں نے بی بی سی (لندن) کے نمائندے اور بی بی سی کے پروگراموں پر سامعین کا ردِعمل معلوم کرنے والے شعبے کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1944ء سے 1946ء تک پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں انگریزی کے شعبے کے صدر رہے۔ 1947ء اور 1948ء میں چین کی نیشنل یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کے فرائض انجام دیے۔ 1949ء میں پاکستان آ گئے۔ 1950ء میں حکومتِ پاکستان کی وزارتِ خارجہ سے وابستہ ہوئے اور اسی سال رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ 1951ء سے 1960ء تک چین اور مراکش میں اعلیٰ سفارتی عہدوں پر فائز رہے۔ 1960ء سے 1970ء تک پاکستان میں تجارت وصنعت کے مشیر تعلقاتِ عامہ کی حیثیت سے کام کیا۔ 1975ء میں حکومت کی دعوت پر امریکہ گئے جہاں بقول ان کے وہ مذاہب کے ماہر بنا دیے گئے اور انہیں قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا فریضہ سونپا گیا جسے انہوں نے چیلنج کے طور پر قبول کر لیا۔ 1977ء سے 1979ء تک وہ کراچی یونیورسٹی کے اعزازی پروفیسر رہے۔ امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں مختلف اوقات میں انہیں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ ان جامعات اور کئی بین الاقوامی مذاکروں میں انہوں نے علم وادب، فلسفے، تاریخ، مذہب، تصور، کلچر وغیرہ کے موضوعات پر لیکچر دیئے۔ 1993ء میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

میرا موضوعِ گفتگو ترقی پسند تحریک سے پروفیسر احمد علی کی وابستگی اور علیحدگی ہے۔ اس باب میں معروف بزرگ ترقی پسند ادیب، دانشور اور تخلیق کار مرحوم خلیق ابراہیم خلیق کا نقطۂ نظر اور مفصل بیان ہے جو انہوں نے اپنی معرکتہ الآراء خودنوشت 'منزلیں گرد کے مانند' کے سترھویں باب کے ابتدائی نو صفحات میں تحریر کیا ہے۔

مرحوم خلیق ابراہیم خلیق نے ان کے ادبی منصب کے حوالے سے رائے زنی کرتے ہوئے فرمایا:

''انہوں نے کل اٹھائیس افسانے لکھے۔ ان میں سے بیشتر افسانے ترقی پسند ادب کی مثالی تحریروں کے زمرے میں آتے ہیں۔۔۔۔ 1940ء میں اپنے انگریزی ناول "Twilight in Delhi" کی اشاعت کے ساتھ وہ برِصغیر کے چوٹی کے ان تین انگریز ادیبوں میں گنے جانے لگے جنہیں انگلستان اور امریکہ کے ادبی حلقوں میں بہت عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ باقی دو ادیب ملک راج آنند اور راجا راؤ ہیں۔ احمد علی کو انگریزی میں افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے علاوہ نقاد، مترجم، ماہرِ تعلیم، محقق اور مقرر کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہوئی۔۔۔۔۔ احمد علی اپنی انگریزی تحریروں میں بھی انسان دوستی، حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کی روش پر قائم رہے ہیں ۔۔۔۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ (ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کے باوصف) تمام بدگمانیوں اور خدشوں کے باوجود احمد علی تمام عمر ترقی پسند رہے اور اپنی ترقی پسندی پر انہیں ہمیشہ فخر رہا۔''

واضح رہے کہ جناب خلیق ابراہیم خلیق، پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر کے ہم سفر ہی نہیں بلکہ ان دونوں شخصیات سے ان کے قریبی مراسم اور ربط وارتباط تھا اور خود مرحوم ترقی پسند نظریے سے ہمیشہ وابستہ رہے اور ترقی پسند

فکر کا پرچارک رہے۔

پروفیسر احمد علی کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور علیحدگی کی تفصیلات جن کی بڑی اہمیت ہے، بیان کرنے سے قبل یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی اور ناوابستگی سے ترقی پسند نظریہ اور فکر مشروط نہیں ہے، کیونکہ میرے نزدیک ترقی پسندیت نہ تو کوئی عقیدہ ہے اور نہ ہی dogma اور نہ کسی منشور یا مینی فیسٹو کے تابع فرمان۔ ترقی پسندیت کی اساس سائنسی فکر ہے اور زندگی اور سماج کے حوالے سے مثبت اقدار و روایات کی ترجمانی ترقی پسندیت کا منصب ٹھہرتا ہے۔

برِصغیر میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کی تاریخ 1936ء ہے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی۔ مگر انسانی معاشرے میں اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ ترقی پسندیت اور ترقی پسند تحریک کی کہانی سماجی ارتقاء کی کہانی کا جزوِ لاینفک ہے۔ سماجی زندگی کے آغازِ سفر سے اس کہانی کی بھی ابتداء ہوتی ہے جب انسان جنگل، غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں آیا اور ایک عرصۂ دراز تک کلی طور پر اجتماعی زندگی یعنی ابتدائی اشتراکیت (primitive communism) کے عہد میں رہا اور یہ عرصہ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کشمکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کشمکش کی تاریخ دراصل سماج میں ترقی پسند قوتوں اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کشمکش، آویزش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس کو معرکۂ خیر و شر بھی سمجھنا چاہئے۔ اسی معرکۂ خیر و شر سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سماج سفرِ ارتقاء پر گامزن ہے۔ سماجی ارتقاء، تغیر و ترقی اور انقلابات کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا قانونِ فطرت کی عمل داری میں سرخ روئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انسان اور انسانی تمدن و تہذیب کا سفر ہمیشہ سے پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ ترقی پسندیت اس پیش رفت کے سفر کی ترجمان رہی ہے۔ پروفیسر احمد علی کا تخلیقی اور نظریاتی سفر مذکورہ پیش رفت کے سفر سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کی ترقی پسندیت کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہئے، اور ترقی پسند تحریک سے ان کی تنظیمی وابستگی اور علیحدگی کو ان کی ترقی پسند فکر اور تخلیقیت سے منسوب کرنا اور اس زاویۂ نظر سے ان کے تخلیقی سفر کا مطالعہ کرنا میرے نزدیک گمراہی پر مبنی ہوگا۔ ترقی پسند ادب کے وہ چند ابتدائی معماروں (pioneers) میں سے تھے اور افسانوں کا مجموعہ 'انگارے' میں جو 1932ء میں شائع ہوا تھا، اس میں پروفیسر احمد علی کے دو افسانے شامل تھے۔ 'انگارے' کی اشاعت سے ترقی پسند تحریک کے تخلیقی سفر کا باضابطہ آغاز ہوا اور چار سال کے بعد 1936ء میں اس تحریک کا تنظیمی دور شروع ہوا۔

1939ء میں پروفیسر احمد علی کی ادبی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو گئے اور اس کے ساتھ انہوں نے اردو میں لکھنا ترک کر کے صرف انگریزی زبان کو اپنے فکر و فن کے اظہار کا وسیلہ بنا لیا اور انگریزی ادب و دانش کی دنیا میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا۔ انجمن سے علیحدگی کے جو وجوہ پروفیسر احمد علی نے 1985ء میں شائع ہونے والے اپنے منتخب اردو افسانوں کے انگریزی تراجم کے مجموعے 'The Prison House' کے پس منظر (Afterword) میں بیان کی ہیں، وہ ان وجوہ سے بہت مختلف ہیں جو سجاد ظہیر نے 1954ء میں شائع ہونے والی اپنی شہرۂ آفاق ''روشنائی'' میں تحریر کی ہیں۔ پروفیسر احمد علی کے بیان کے مطابق انجمن سے علیحدگی کا سبب وہ اختلافات تھے جو 1937ء۔1938ء میں انجمن کے سہ ماہی انگریزی جریدے 'New Indian Literature' کی ادارتی پالیسی کے سلسلے میں ان کے اور سجاد ظہیر کے درمیان پیدا ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ اس جریدے کی اسکیم پروفیسر احمد علی نے تیار کی تھی جو دسمبر 1938ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں منظور کی گئی تھی اور مذکورہ رسالے کے ادارتی اور انتظامی امور اور فرائض پروفیسر احمد علی، ملک راج آنند، اور ڈاکٹر عبدالعلیم کو سونپے تھے۔ بقول پروفیسر احمد علی اختلافات ترقی پسندی کے مفہوم کے بارے میں تھے۔ سجاد ظہیر کا نقطۂ نظر مارکسی تھا اور انہیں صاحب زادہ محمود الظفر، ملک راج آنند اور ڈاکٹر عبدالعلیم کی حمایت حاصل تھی۔ سجاد ظہیر صرف پرولتاری ادب یعنی اس ادب کو جو مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کے بارے میں ہو، ترقی پسند ادب قرار دیتے تھے، جبکہ پروفیسر احمد علی کا موقف یہ تھا کہ ادب کو کمیونزم کے تنگنائے میں محدود نہیں کیا جا سکتا، زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے اور متوسط طبقے کی زندگی کے بارے میں بھی جس سے تحریک کے بانی ارکان کا تعلق تھا، ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے لکھا جا سکتا ہے۔

سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یادداشتوں پر مبنی مذکورہ بالا کتاب 'روشنائی' میں کہیں بھی پروفیسر احمد علی سے نظریاتی اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے پروفیسر کی خدمات کا بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بھرپور تذکرہ کیا ہے اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا اور نازک مزاجی کو انجمن سے ان کی علیحدگی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ سجاد ظہیر کے بقول پروفیسر احمد علی تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے اور انہیں ہم چو من دیگرے نیست کا زعم تھا۔ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ انجمن کے نوجوان ارکان نہ تو ان کی ادبی صلاحیتوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ان کا اس طرح احترام کرتے ہیں جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

''علی سردار جعفری، سبطِ حسن، مجاز وغیرہ جو اس زمانے میں لکھنؤ میں نوجوان ترقی پسندوں کے سب سے زیادہ بلند آہنگ، ہنگامہ خیز بلکہ شوریدہ سر مبلغ تھے، احمد علی کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے آرٹ کو بھی مشتبہ نظر

وں سے دیکھتے تھے اور ان کی ترقی پسندی میں خلوص اور گہرائی کی کمی پاتے تھے۔ ادھر احمد علی اپنے مقابلے میں ان لوگوں کو نو آموز اور کم علم سمجھتے تھے۔''

1939ء میں 'New Indian Literature' کے دو شمارے نکلنے کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی جس کا ایک سبب ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان کے درمیان اختلافِ رائے تھا۔ سجاد ظہیر کے لفظوں میں:

''احمد علی کی اس بات سے ناراض تھے کہ ملک راج آنند کیوں رفتہ رفتہ چیف ایڈیٹر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ آنند کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی کشیدگی بڑھتی گئی اور آخر کار احمد علی نے رسالے کا تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دو ہم خیال لوگوں کی یہ رقابت اور کشیدگی اس وقت میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔ بعد کو مجھے اس کا کافی تجربہ ہوا۔ میری چونکہ دونوں سے ذاتی دوستی تھی اس لئے میں نے باہم غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، مگر احمد علی رسالے کے لئے کام کرنے کے واسطے تیار نہیں ہوئے۔''

جناب خلیق ابراہیم خلیق کے بیان کے مطابق:

''احمد علی کو سجاد ظہیر سے شکایت ہے کہ انہوں نے 'روشنائی' میں 'انگارے' کی اشاعت، اس کی ضبطی اور اس کے دفاع میں محمود الظفر اور احمد علی کے بیان کو سرے سے نظر انداز کیا ہے (محمود الظفر اور احمد علی کا مشترکہ بیان الہ آباد سے انگریزی روزنامے 'لیڈر' کے 5 اپریل 1933ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور اس میں 'انگارے' کے دفاع کے ساتھ ساتھ ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی اپیل کی گئی تھی)۔ یہ شکایت صرف جزوی طور پر صحیح ہے۔ 'روشنائی' میں سجاد ظہیر نے 1931ء میں احمد علی سے اپنی ملاقات، ان کے ساتھ مل کر 'انگارے' کی ترتیب، اس کی اشاعت پر رجعت پسندوں کے ہنگامے اور اس کی ضبطی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ 'اس ہنگامہ خیزی سے شائد گھبرا کر احمد علی دو ڈھائی سال سے نسبتاً گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔''

یہاں سجاد ظہیر سے سہو ہوا ہے۔ ایک تو ان واقعات کو گزرے ایک مدت ہوگئی تھی اور محمود الظفر اور احمد علی نے جب یہ بیان جاری کیا ہے کہ اس سے پہلے وہ لندن جا چکے تھے۔ لہٰذا یہ بات ان کے ذہن سے نکل گئی کہ 'انگارے' کی اشاعت پر ہنگامہ خیزی کے بعد محمود الظفر اور احمد علی نے آزادانہ اظہارِ رائے کے حق میں آواز بلند کی اور ترقی پسند لکھنے والوں کی انجمن کے قیام پر زور دیا۔ اس بیان سے انہوں نے اگر جان بوجھ کر چشم پوشی کی ہوتی تو احمد علی کے بارے میں نسبتاً گوشہ نشینی کی بحث کرنے کے فوراً بعد یہ نہ لکھتے:

''لیکن جب ہم تین سال بعد الہ آباد میں دوبارہ ملے تو انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بارے میں گرم جوشی کا اظہار کیا، چنانچہ ان کا گھر ہمارا دفتر بن گیا جہاں بیٹھ کر احمد علی اور میں ترقی پسند مصنفین کی مجوزہ تحریک کے متعلق منصوبے بنانے لگے اور اس سلسلے میں خط وکتابت کرنے لگے۔ احمد علی نے مجھے اپنے دوستوں سے بھی ملایا، ان میں رگھوپتی سہائے، فراق اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین بھی تھے۔''

پروفیسر احمد علی کی فکری جہتوں اور نظریاتی سرحدوں کے حوالے سے جناب خلیق ابراہیم خلیق نے تحریر کیا ہے:

''وہ اگرچہ سجاد ظہیر اور محمود الظفر کی طرح کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن اشتراکیت کی جانب ان کا رویہ ہمدردانہ تھا اور انسانیت کو درپیش بیش تر مسائل پر ان کی سوچ وہی تھی جو ان کے کمیونسٹ دوستوں کی تھی۔ ادب وفن کے بارے میں مارکس، اینگلز اور لینن کے خیالات اور رویوں میں جو وسعتِ فکر کارفرما تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز میں بہت سے ترقی پسند نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں امتیاز نہیں کر پاتے تھے اور سارے پرانے ادب کو رجعت پسندانہ گردانتے تھے۔ سجاد ظہیر نے تحریک کو اس فکری انتشار پسندی سے بچانے میں جو انتہائی اہم کردار ادا کیا اور اپنے ادبی اور تہذیبی ورثے کی پرکھ میں جس بالغ النظری اور ژرف نگاہی سے کام لیا، وہ احمد علی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سجاد ظہیر کے نزدیک ترقی پسند ادب کی تحریک مختلف خیالات رکھنے والے ان تمام ادیبوں اور دانشوروں کے اتحاد کی تحریک تھی جو حریت پسند، جمہوریت نواز اور انسانیت دوست تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ترقی پسندی کا جو مفہوم ان کے ذہن میں ہے وہی سجاد ظہیر کے ذہن میں بھی ہے۔''

ان معروضات کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پروفیسر احمد علی ایک عظیم سیکولر ترقی پسند مفکر، دانشور اور تخلیق کار ہیں۔ سیکولرازم کے حوالے سے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سیکولرازم کو لادینیت اور دہریت کا ہم معنی قرار دینا مفاد پرست اور رجعت پسند حلقوں کا پروپیگنڈا ہے۔ سیکولرازم کے سادہ معنی اور مفہوم ریاست کا مذہبی امور میں غیر جانب داری کا کردار ہے اور اس تصور کی مختصر ترین وضاحت قائدِ اعظم کے اس فقرے سے ہوتی ہے کہ Religion has nothing to do with the business of state۔ پروفیسر احمد علی کی دنیائے فکر و دانش میں زندگی اور سماج کے حوالے سے یاسیت اور قنوطیت کی تیرگی کے لئے کوئی جگہ نہیں پائی جاتی ان کے نوکِ قلم سے کبھی تیرگی کو فروغ نہیں ملا بلکہ

روشنی کا سرچشمہ پھوٹتا رہا۔

پروفیسر احمد علی جیسی بلند قامت شخصیت اور ان کے تخلیقی کارناموں کو وہ شہرت اور قبولیتِ عام حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کا بنیادی سبب ان کا انگریزی زبان کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانا ٹھہرتا ہے، کیونکہ ہندو پاک میں انگریزی ادب کے قارئین کا دائرہ کار یقیناً بہت محدود ہے، مگر جو حلقے ان کی تخلیقی فکری و علمی دانش وری کی عظمتوں اور رفعتوں کا ادراک رکھتے ہیں ان کے نزدیک وہ ایک نابغۂ روزگار کے منصب و مقام کے مالک ہیں۔ اور ترقی پسند تخلیق کاروں کی کہکشاں جو آسمانِ ادب پر سجی ہے وہاں وہ ایک بڑے سیارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی ایک زمینی حقیقت ہے کہ ترقی پسند حلقوں میں ان کی طرف سے تحفظات رہے تھے اور 1949ء میں یہ بات چلی تھی کہ پروفیسر احمد علی اب ترقی پسند ادیب نہیں رہے۔ یہ وہ دور تھا جب متعدد مستند ادیبوں اور تخلیق کاروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے قبیلے سے خارج کیا تھا۔ 1949ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں جو اعلان نامہ منظور ہوا تھا وہ انتہا پسندی کا حامل تھا جس میں ادیبوں کو منشور کا پابند کیا گیا تھا، گویا اشتراکیت کی حمایت اور پرچار کو ادب کے فرائضِ منصبی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ یہی کچھ ہندوستان میں بھمڑی میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے اعلان نامے کی غرض و غایت قرار پایا تھا۔ یہ انتہا پسندی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی اور 1952ء میں کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں جو اعلان نامہ منظور ہوا تھا گویا گزشتہ اعلان نامے کے انتہا پسندانہ موقف کی تصحیح تھا۔ یہی صورتِ حال ہندوستان میں دیکھنے میں آئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی مذکورہ انتہا پسندی بلا جواز نہیں تھی بلکہ اس دور کا عطیہ تھی جب عالمی پیمانے پر ترقی پسند طاقتیں پوری توانائی سے ابھر رہی تھیں۔ چین میں اشتراکی انقلاب رونما ہو چکا تھا دوسری طرف نوآبادیاتی نظام شکست و ریخت سے دوچار تھا۔ عظیم برطانیہ اپنی عظمت گنوا بیٹھا اور وہ سلطنت تاریخ کے صفحات میں گم ہو رہی تھی جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ سوویت یونین انقلابِ اکتوبر 1917ء کے تیس برس کے اندر 1947ء میں ایک سپر پاور بن کر کرۂ ارض پر نمودار ہو چکا تھا اور سوویت یونین ساری دنیا میں چلنے والی قومی آزادی کی تحریکوں کو اخلاقی، سیاسی اور مادی امداد کی اہلیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ وہ عالمی منظر نامہ تھا جس کے تناظر میں ترقی پسند تحریک میں ایسے عنصر کا ظہور ہوا جسے ہم بائیں بازو کی انتہاء پسندی کہتے ہیں، چنانچہ ان غیر معمولی سماجی حالات میں ادب کے سماجی منصب اور کردار کو اتنی پذیرائی دی گئی کہ ادب کی جمالیات کو ثانوی حیثیت دے دی گئی اور غزل بحیثیت صنفِ سخن معتوں ٹھہری اور ترقی پسند مشن اور آدرش کی ترجمانی کرنے کی اہلیت سے محروم قرار دی گئی۔ بہرحال یہ دور پچاس کی دہائی کے آغاز ہی میں اپنے نقطۂ اختتام پر پہنچا۔ اس تاریخی پس منظر میں ترقی پسند حلقوں کی طرف سے پروفیسر احمد علی کو نظر انداز کرنے اور ان کی طرف سے بے اعتنائی برتنے کی بات ناقابلِ فہم نہیں ٹھہرتی۔ پروفیسر احمد علی کی طرح ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ بھی ترقی پسند حلقوں میں کچھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا میرے نزدیک یہ رویہ اور موقف غلط تھا۔ یہ رویہ اور موقف ترقی پسند حلقے کی اکثریت کا نہیں تھا بلکہ ایک بہت چھوٹی اقلیت اس کی حامی تھی۔ 1986ء میں جب کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی تھی اس میں بحیثیت مندوب شرکت کی دعوت جن اکابر کو دی گئی تھی، ان میں پروفیسر احمد علی کا نام شامل تھا۔ انہوں نے مذکورہ کانفرنس میں بوجوہ شرکت نہیں کی تھی۔ یہ الگ ہے، مگر کانفرنس کی تنظیمی کمیٹی کو، اس کے سرپرست سید سبطِ حسن، چیئرمین جناب شوکت صدیقی اور راقم اس کے جنرل سیکرٹری تھے، ان کی عدم شرکت کا افسوس ہوا تھا۔ بڑی تکریم و احترام کے ساتھ جناب احمد ندیم قاسمی کو بھی مدعو کیا گیا تھا، وہ بھی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے، مگر ان کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد کانفرنس میں شریک ہوئی تھی۔

مذکورہ کانفرنس میں پروفیسر احمد علی کی عدم شرکت سے ان کی ترقی پسندیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے اور پروفیسر مجتبیٰ حسین گورکھپوری کی کانفرنس میں موجودگی کانفرنس کے وقار میں اضافے کا باعث بنی تھی۔ اگر پروفیسر احمد علی بھی موجود ہوتے تو کانفرنس کی وقعت میں مزید اضافہ ہوتا۔ پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حوالے سے ترقی پسند حلقوں یں تحفظات کا ایک سبب ان اکابرِ ادب کا حکومتِ وقت کے establishment کے ساتھ وابستگی اور مختلف اعلیٰ منصبوں پر فائز ہونا بھی تھا۔ یہ وجہ شکایت بھی میرے نزدیک صائب بات نہیں تھی کیونکہ ان کے علاوہ متعدد ترقی پسند اکابر بھی مختلف وقتوں میں حکومت کے قریب رہے اور انہیں قابلِ ذکر منصب بھی حاصل رہا۔ ان میں جناب شوکت صدیقی کا نام بھی شامل ہے جو ایوبی دور میں پاکستان رائٹرز گلڈ میں کلیدی منصب پر فائز تھے۔ اس ضمن میں جناب فیض احمد فیضؔ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو بھٹو دورِ حکومت میں ثقافت کے امور کے باضابطہ مشیر رہے تھے۔ غرض یہ کہ پروفیسر احمد علی کی اس حوالے سے ترقی پسندوں کی سرد مہری کا سزاوار قرار دیا جانا نا مناسب تھا۔ علاوہ ازیں ان کی پہچان ایک بڑے مذہبی اسکالر کی بھی تھی اور قرآن مجید کا ترجمہ ان کا ایک کارنامہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مذہب سے اس نوعیت کی گہری دلچسپی اور وابستگی بھی کچھ ترقی پسند حلقوں کے لئے ان کی ترقی پسندیت کے باب میں ایک سوالیہ نشان تھا۔ یہاں بھی مجھے اس حلقے سے شدید اختلاف ہے۔ جو لوگ ترقی پسندیت کو اشتراکیت پسندی یا دہریت پسندی سے مشروط کرتے ہیں، وہ تنگ نظری کے اندھیرے میں ہیں اور میں انہیں برخود غلط سمجھتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک کے پرجوش حامیوں میں مولانا حسرت موہانی تھے اور مولانا سید سلمان ندوی نے بھی ترقی

باقی صفحہ نمبر 17 پر

زلزلوں سے کیسے نپٹا جائے

ڈاکٹر غلام مجتبیٰ

کچھ عرصے سے ہم آئے دن زلزلوں کی تباہ کاریوں کا سنتے آرہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں انڈونیشیا کے سمندر سے اٹھنے والی سونامی کے نتیجے میں بحر ہند کے آس پاس کے ملکوں میں آنے والی جانی و مالی تباہی کو دنیا ابھی بھولی نہیں تھی کہ اسی برس 2005 میں کشمیر میں آئے زلزلے نے وسیع جانی و مالی نقصان سے دوچار کر دیا۔ اب جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک کو بھی زلزلے اور اس کے نتیجے میں آئی سونامی نے تباہی اور بربادی سے دوچار کر دیا ہے۔ ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے زلزلوں کا تواتر زیادہ ہو گیا ہے اور اس کی ممکنہ ہولناکیوں کا سوچ کر ہر کوئی سہم سا گیا ہے۔

کبھی انسان زلزلوں کے آنے کی وجہ کے بارے میں طرح طرح کے خیالات رکھتا تھا لیکن اب اس معاملے میں اس کا علم و فہم بہت وسیع ہو چکا ہے۔ اب ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ زلزلہ کہاں، کیسے اور کیوں آتا ہے۔ ہاں اس کے بارے میں یقین سے یہ بتا پانا کہ یہ کب آئے گا یعنی دن اور وقت کے تعین کا اندازہ کرنا ابھی تک ایک مشکل کام ہے لیکن ماہرین اس سے حتی الامکان بچنے کا مکمل منصوبہ بتا سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ ارباب اختیار ان کی سنیں اور ان کی تجاویز پر عمل کریں۔

دھرتی کی سطحی تہ یا چھلکا اور اس میں موجود چٹانیں بظاہر بے جان نظر آتی ہیں لیکن جدلیات کے پہلے کلیے کے مطابق در حقیقت یہ متحرک ہیں اور پلیٹ کی شکل میں ایک سمت سے دوسری سمت رواں دواں اور کشمکش کا شکار ہیں۔ کہیں یہ بے رخی سے ایک دوسرے سے پرے جاتی ہیں تو کہیں یہ ایک دوسری کے مدمقابل الجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ براعظمی پلیٹ کی چٹانوں کی اوسط کثافت ڈھائی جب کہ سمندری پلیٹ کے مادے کی اوسط کثافت ساڑھے تین یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سمندری پلیٹ ایک سرے پر باقاعدہ جنم لیتی ہے اور اپنی عمر پوری کر کے دوسرے سرے پر دوسری پلیٹ سے مڈبھیڑ کے بعد زیر زمین غرق ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ غرق ہوتی ہے وہاں سمندر کی تہ میں بڑی بڑی کھائیاں وجود میں آتی ہیں جو دھرتی پر موجود پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی زیادہ گہری ہو سکتی ہیں۔ فلپائن کے سمندر میں موجود مریانا کھائی ہمالیہ سلسلے کی چوٹی کوہ ایوریسٹ کی بلندی سے بھی زیادہ گہری ہے۔

پلیٹوں کے مابین زور آزمائی کے پہلے مرحلے میں جدلیات کے دوسرے کلیے کے مطابق ایک لمبے عرصے کے لئے دباؤ جمع ہوتا رہتا ہے جب کہ پلیٹوں کے سرے پر امن رہتے ہیں۔ جب دباؤ ان کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو غرق ہونے والی پلیٹ کا سرا پر تشدد ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہوا جدلیات کے تیسرے کلیے کے مطابق نفی کی نفی کرتا ہوا اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران بے پناہ توانائی خارج ہوتی ہے اور سمندر کی بلند و بالا لہروں کی شکل میں چاروں طرف پھیل جاتی ہے جس سے سونامی پیدا ہوتی ہے۔

ہمارا کرۂ ارض سطح زمین سے اپنے مرکز کی طرف ہیئت کے اعتبار سے تین زونوں میں تقسیم ہے۔ اوپری پتلا خول چھلکا یا کرسٹ کہلاتا ہے جو سخت چٹانوں سے بنا ہے۔ درمیانہ موٹا حصہ مانٹل کہلاتا ہے جو خاصا گرم ہے اور جہاں چٹانیں پگھلی ہوئی ہیں۔ تیسرا اور اندرونی حصہ کور کہلاتا ہے جہاں بھاری دھاتیں مائع شکل میں جمع ہو گئی ہیں اور جس کے مرکز میں لوہے کا ایک بڑا گولا ٹھوس شکل میں موجود ہے۔

سمندری پلیٹ کے جو ٹکڑے نیچے مانٹل میں غرق ہوتے ہیں وہ گہرائی میں موجود شدید حرارت کی وجہ سے پگھلتے ہیں اور اس کا ہلکا مواد مقابل کی سمندری پلیٹ میں موجود دراڑوں میں سے راستہ پا کر اوپر اٹھتا ہے اور سمندر کی تہ میں آتش فشانی پیدا کرتا ہے جس سے سمندر میں جزائر کی محرابی لڑی پیدا ہوتی ہے۔ انڈونیشیا، فلپائن، جاپان اور کیوبا کے مقام پر کیریبئن کے جزائر کی لڑی سمندری پلیٹوں کے اس ٹکراؤ کی مثال ہے۔ ٹن، نکل اور کرومیم جیسی قیمتی دھاتیں انہی جزیروں پر ملتی ہیں۔

پلیٹوں کا دوسری طرح کا الجھاؤ خشکی پر براعظمی پلیٹوں کے مابین نظر آتا ہے۔ چونکہ براعظمی پلیٹ سمندری پلیٹ کے مقابلے میں ہلکے مواد سے بنی ہوتی ہے اس لئے دونوں میں سے کوئی بھی نیچے مانٹل کے اندر دھنسنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ یہاں دونوں ہلکی پلیٹوں کے مابین دنگل کا فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے اور نتیجہ دونوں کے کچھم گچھا ہونے کی صورت میں دوہرے چوہرے ہو کر تہ در تہ پہاڑ کھڑے کرنے میں نکلتا ہے۔ ایشیا میں ہمالیہ اور یورپ میں الپس کے عظیم پہاڑی سلسلے اسی الجھاؤ کی کڑی ہیں۔

کشمیر کا زلزلہ براعظمی پلیٹوں کے ایسے ہی جوڑ پر ٹکراؤ کے نتیجے میں آیا۔ جب بے شمار زلزلوں کے نتیجے میں خشکی پر ہمالیہ جیسا بلند و بالا پہاڑی سلسلہ وجود میں آ جاتا ہے اور اسے مزید اٹھانا ممکن نہیں رہتا تو پلیٹوں کے جوڑ سے ہٹ کر براعظمی پلیٹ کے بیچوں بیچ دوسری دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہاں نئے پہاڑی سلسلے وجود میں آتے ہیں تاکہ سمندری پلیٹوں کی طرف سے آنے والے دباؤ کو براعظمی پلیٹوں میں جذب کیا جا سکے۔ کشمیر و مرگلہ کا پہاڑی سلسلہ اور اس کے بعد سلسلہ کوہ نمک اسی نتیجے میں وجود آئے۔

پلیٹوں کا تیسری طرح کا ٹکراؤ سمندری پلیٹ کے براعظمی پلیٹ سے الجھنے اور اس کے نیچے دھنسنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ فاصلے پر خشکی پر آتش فشاں پہاڑوں کی زنجیر نظر آتی ہے۔ اس آتش فشانی کے نتیجے میں ان پہاڑوں کے اردگرد معمولی گہرائی پر تانبے، سونے و چاندی کے ذخائر ملتے ہیں۔ بلوچستان میں سلسلہ کوہ سلطان جو چاغی سے لے کر ریکو ڈیک اور سیندک تک پھیلا ہوا ہے ایسے ذخائر سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں بحیرۂ عرب کی سمندری پلیٹ مکران کی براعظمی پلیٹ کے نیچے دھنس رہی ہے۔ تانبے کے ایسے ہی وسیع ذخائر جنوبی امریکہ کے ملک چلی میں ملتے ہیں جہاں بحرالکاہل کی سمندری پلیٹ لاطینی امریکہ کی براعظمی پلیٹ کے نیچے دھنس رہی ہے۔

کسی بھی زلزلے کو کئی طرح سے جانچا جاتا ہے۔ پلیٹوں کی رگڑ کے نتیجے میں جو توانائی خارج ہوتی ہے اس کی 'طاقت' کو ریکٹر سکیل پر ناپا جاتا ہے۔ اس سکیل پر ایک نمبر کا اضافہ دس گنا زیادہ توانائی ظاہر کرتا ہے۔ یعنی چھ کے

مقابلے میں سات طاقت کا زلزلہ دس گنا زیادہ توانائی خارج کرتا ہے۔ زیادہ گہرائی میں آنے والے زلزلوں کی توانائی کافی حد تک زمین کے اندر ہی جذب ہو جاتی ہے۔

زلزہ پیمائی کے لئے دھرتی پر پھیلے کم از کم تین مقامات سے زلزلہ پیما کا ریکارڈ شدہ ڈیٹا سامنے آنا ضروری ہے تب ہی اس کی طاقت، گہرائی اور انداز کا صحیح تعین کیا جا سکتا ہے۔ آج کل اس کام کے لئے عالمی نیٹ ورک بنے ہوئے ہیں جہاں سے ڈیٹا امریکہ جاتا ہے اور وہاں ماہرین چند منٹوں میں حساب کتاب کر کے تفصیل انٹرنیٹ پر جاری کر دیتے ہیں۔ یہ نیٹ ورک اتنے حساس ہیں کہ خفیف سے خفیف دھماکوں کی نوعیت کا بھی پتہ چلا لیتے ہیں۔ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے اس نیٹ ورک کا حصہ نہ بن سکا اور اسے اپنے ہی علاقے میں آئے زلزلوں کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے انٹرنیٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

زلزلے کی 'شدت' زلزلے والے مقام پر زیادہ اور دور مقامات پر کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ اسے سنواری ہوئی مرکلی سکیل پر ناپا جاتا ہے۔ اگر کھڑکیاں تھرتھرائیں تو کم نمبر اور اگر میز پر رکھی چیزیں الٹ جائیں تو زیادہ نمبر رکھا جاتا ہے۔ جیسے کشمیر میں آئے زلزلے کی شدت بالاکوٹ میں تو گیارہ تھی جہاں پچانوے فیصد عمارتیں زمیں بوس ہو گئیں۔ اسلام آباد میں پانچ ہو گی جہاں آدھی عمارتوں میں دراڑیں پڑ گئیں لیکن لاہور میں تین ہو گی جہاں صرف در و بام ہی لرز پائے۔ کسی بھی زلزلے کی طاقت ایک خاص درجہ ہوتی ہے جب کہ شدت دوری کے حساب سے بدلتی اور کم ہوتی رہتی ہے۔

دھرتی پر آئے زلزلے کے نتیجے میں چار قسم کی لہریں خارج ہوتی ہیں۔ پہلی دو قسم کی لہریں کرۂ زمین کے اندر سے گزر سکتی ہیں جب کہ دوسری دو قسم کی لہریں سطح زمیں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ جب تعمیراتی ڈھانچوں میں سے گزرتی ہیں تو ان کے بعض سروں اور کونوں کو کھدیڑ دیتی ہیں۔ اگر یہ عمارتی ڈھانچے اور ان کی بنیادیں زلزلے کی انجینئرنگ کے اصولوں کے مطابق ڈیزائن کئے جائیں تو وہ شدید سے شدید زلزلے کو بھی سہار سکتی ہیں۔

اب یہ تو ہم جان چکے ہیں کہ دھرتی کے چھلکے میں کہاں کہاں دراڑیں موجود ہیں اور وہاں کیسا کیسا دباؤ موجود ہے۔ زلزلے انہی دراڑوں کے ساتھ ساتھ پلیٹوں کی حرکت کے نتیجے میں آتے ہیں۔ سمندری پلیٹ بھاری لیکن پتلی ہوتی ہے جب کہ براعظمی پلیٹ ہلکی لیکن موٹی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر سمندری زلزلے کم گہرائی پر آتے ہیں جب کہ خشکی پر آنے والے زیادہ تر زلزلے زیادہ گہرائی میں آتے ہیں اور کم خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی خشکی پر کوئی زلزلہ اگر کم گہرائی پر مثلاً دس کلومیٹر سے کم گہرائی پر آ جائے تو کم طاقت والا زلزلہ بھی ہولناک ثابت ہو سکتا ہے۔

دھرتی کی تاریخ میں ان گنت زلزلے آئے ہونگے کہ آج ہم براعظموں اور سمندروں اور پہاڑوں کی موجودہ شکل دیکھ پا رہے ہیں۔ کشمیر میں 2005 میں آئے زوردار زلزلے نے دراڑ کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کو سوا میٹر کے قریب بلند کر دیا۔ ماضی میں ایسے کتنے ہی زلزلے آئے ہونگے کہ آج ہمالیہ کے پہاڑ 9 کلومیٹر سے زیادہ بلند و بالا ہو چکے ہیں۔

کم طاقت کے زلزلے زیادہ تواتر سے بلکہ قریب ہر وقت آتے رہتے ہیں جب کہ زیادہ طاقت کے زلزلے کم تواتر سے آتے ہیں۔ البتہ ہر طاقت کے زلزلے کے تواتر کے بارے میں ماہرین نے ماضی کے شواہد کی بنا پر اندازے لگا رکھے ہیں۔ جیسے کشمیر میں آئے زلزلے کے بارے میں ایک اچھے اندازے کے مطابق ایک سو برس کے دوران اسی علاقے میں اتنے درجے کا ایک زلزلہ واقع ہو سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا ہی زلزلہ کوئی ایک سو برس قبل بھی کشمیر میں اس جگہ کے آس پاس آیا تھا لیکن اس میں جانی و مالی نقصان بہت ہی کم ہوا تھا کیوں کہ تب آبادیوں اور کنکریٹ کی عمارتوں کا ایسا رواج نہ تھا۔

زلزلے جہاں تباہی کا باعث بنتے ہیں وہاں زمین میں پنہاں معدنی خزانے اگلنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ماہرین نے سو برس کے سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر دنیا کے ہر علاقے کے ایسے نقشے تیار کئے ہیں جہاں خطوں کو ہر درجے کے زلزلوں کے آنے کے امکانات اور مقامی زمینی ساخت کی بنا پر کم یا زیادہ رسک میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کی بنیاد پر بلڈنگ کوڈ ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اگر اس کوڈ پر صحیح طریقے سے عمل کر لیا جائے تو زلزلے آنے کی صورت میں نوے فیصد سے زیادہ عمارتیں محفوظ رہتی ہیں۔

جاپان میں طاقتور ترین زلزلہ آنے سے جو تباہی ہوئی وہ عمارتوں کے گرنے سے نہیں بلکہ سونامی آنے کے نتیجے میں لہروں کی طاقت اور اس کے نتیجے میں شکست و ریخت سے ہوئی۔ ایٹمی بجلی کے پلانٹوں کی عمارتیں تو محفوظ رہیں لیکن ان کو نیشنل گرڈ سے بجلی کی فراہمی منقطع ہونے سے ایٹمی ایندھن والی راڈوں کو ٹھنڈا کرنے والے سسٹم کے پمپ فیل ہوئے اور سسٹم کو گرم ہونے سے بچانے کے لئے بھاپ کو خارج کرنا پڑا جس سے کچھ تابکاری پھیلی۔ البتہ ماہرین نے جلد ہی سسٹم بحال کر کے تابکاری کے اخراج کے بڑے حادثے سے ماحول بچا لیا۔ بڑے زلزلوں سے سب سے زیادہ خطرہ ایٹمی ری ایکٹرز کو یا پھر ڈیموں کو ہو سکتا ہے جن کی تعمیری ساخت کو زیادہ سے زیادہ ممکن خطرے کو سامنے رکھ کر محفوظ طریقے سے بنایا جانا ضروری ہے۔

زلزلے کی پیشینگوئی کے معاملے میں ماہرین کو ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی البتہ کوششیں جاری ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زلزلوں کے اثرات سے ممکن حد تک بچا جا سکتا ہے۔ نہ زلزلوں کا تواتر بڑھا ہے نہ ان کے تواتر کو روکا جا سکتا ہے نہ اس کے بارے میں دن اور وقت بتا کر خبردار کیا جا سکتا ہے تو پھر ہم احتیاط کریں بھی تو کیا کریں؟ یہ کہ اگر ہم اصرار کریں کہ ہم زلزلوں کی شدت والے علاقوں میں آبادیاں ضرور قائم کریں گے اور پاکستان میں کسی بھی جگہ عمارت کی تعمیر میں بلڈنگ کوڈ کا خیال نہیں رکھیں گے تو آئندہ ناقابل تصور تباہی ہمارا مقدر ہو سکتی ہے۔

لاہور تو کم رسک والے علاقے میں واقع ہے البتہ اسلام آباد اور کراچی گہری دراڑوں کے قریب واقع ہونے کے ناطے زیادہ رسک والے علاقوں میں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی کو سونامی سے بھی اگرچہ کم درجے کا لیکن خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہمارا تعمیرات اور بود و باش کا انداز بتا رہا ہے کہ ان دو شہروں کو مستقبل میں ہولناک تباہی کا سامنا ہو سکتا ہے جس کے لئے ہم بالکل بھی تیار نہیں ہیں۔

ورکرز پارٹی پاکستان کی سنٹرل کمیٹی کے پانچویں اجلاس منعقدہ کراچی کی روداد

ورکرز پارٹی پاکستان کی سنٹرل کمیٹی کا پانچواں اجلاس 19/20 فروری 2011 کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل اراکین نے شرکت کی۔

عابد حسن منٹو، یوسف مستی خان، اختر حسین، چوہدری فتح محمد، محمد صدیق ڈوگر، محمد ظہور خان، صفدر حسین سندھو، اے۔آر۔ عارف، منظور رضی، حسن عسکری، جاوید اختر، عزیز عباسی، جمیل شاہد، اقبال سلطانہ، مشتاق نظامانی اور شاہ نور۔

اجلاس کے ایجنڈے میں سنٹرل کمیٹی کے گزشتہ اجلاس منعقدہ لاہور 6 نومبر 2010 میں کئے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کی رپورٹ کے علاوہ پارٹی تنظیمی امور، عوامی محاذوں پر کام و مشکلات اور سیاسی صورت حال پر بحث کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

1۔ اجلاس میں شریک نہ ہونے والے اراکین کی اکثریت نے مختلف ذاتی وجوہات کے بارے میں آگاہ کیا سوائے جناب ملک محمد علی بھارا اور چوہدری عبدالطیف جنہوں نے پارٹی کی تشکیل کے بعد کسی بھی اجلاس میں شرکت نہیں کی ہے لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ جناب حسن عسکری اور چوہدر فتح محمد ملک محمد علی بھارا صاحب سے اور ظہور خان، محمد صدیق ڈوگر اور چوہدری فتح محمد چوہدری عبدالطیف سے ملاقات کریں گے اور آئندہ اجلاس میں تحریری رپورٹ دیں گے۔ ویسے تو عام اطلاع کے مطابق ان کے نہ آنے کی وجہ عمر اور صحت اور سفری مشکلات ہیں مگر ذاتی ملاقات کر کے رپورٹ کی ضرورت ہے تاکہ تنظیمی طور پر فیصلے کئے جاسکیں۔

2۔ جناب جاوید اختر صاحب نے پریس کے بارے میں جائزہ رپورٹ پیش کی۔ فیصلہ کیا گیا کہ وہ رپورٹ کو ٹائپ کرا کے تمام اراکین میں سرکولیٹ کریں تا کہ آئندہ اجلاس میں فیصلہ کیا جا سکے۔ چیمبر آف کامرس کے ساتھ بھی اجلاس مارچ کے بعد یعنی اپریل میں کرایا جائے۔ انتظام یوسف مستی خان اور جاوید اختر کریں گے۔

3۔ نوجوان محاذ کے حوالے سے چوہدری نعیم شاکر اور حمزہ ورک صاحب مصدق صاحب سے گفتگو کر کے آئندہ اجلاس میں رپورٹ پیش کریں گے۔

4۔ سندھ میں پارٹی کو منظم کرنے کے لئے جاوید اختر، صوفی عبدالخالق، یوسف مستی خان، ظہور خاں، منظور رضی، حسن عسکری، اختر حسین پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے کنوینر جاوید اختر ہوں گے۔ یہ کمیٹی کوشش کرے گی کہ جلد از جلد سندھ کی صوبائی کانفرنس منعقد کر کے پارٹی تنظیم کو بڑھایا جائے۔ سنٹرل کمیٹی کے آئندہ اجلاس میں یہ کمیٹی رپورٹ پیش کرے گی اور اس کے بعد سندھ کانفرنس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

5۔ پنجاب صوبائی کانفرنس کے حوالے سے جو خانیوال کے ساتھیوں نے کچھ اعتراضات کئے ہیں ان کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ:

i) دستور کے مطابق آئندہ مرکزی یا صوبائی کانفرنس سے قبل باقاعدہ نمائندگی کے اصول یعنی ہر صوبے یا ضلع یا یونٹ سے ڈیلی گیٹس اور کمیٹی کے اراکین کی تعداد کے بارے میں تفصیلاً طے کیا جائے گا تاکہ شکایات کا موقع نہ ملے اور یہ چونکہ پہلی کانفرنس تھی لہٰذا ساتھی غلطیوں کو درگزر کرتے ہوئے تنظیم کو بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

ii) پنجاب کی صوبائی کمیٹی سے سفارش کی جاتی ہے کہ خانیوال سے ناصر اقبال ساہو کو صوبائی کمیٹی میں نامزد کر لیں جس کی دستور بھی اجازت دیتا ہے۔

iii) آئندہ پارٹی تنظیم کے معاملات پر کوئی بھی متنازعہ مسئلہ عوامی جمہوریت میں شائع نہیں کیا جائے گا۔

6۔ ٹریڈ یونین محاذ کے حوالے سے چار اراکین پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی جن میں صفدر حسین سندھو، عزیز عباسی، منظور رضی اور جاوید اختر اس کمیٹی کے کنوینر منظور رضی ہونگے۔ یہ کمیٹی مختلف فیڈریشنوں کے ممکنہ ادغام اور ٹریڈ یونین تنظیم و تحریک کے حوالوں سے فیصلے کرے گی اور کنوینر آئندہ اجلاس میں رپورٹ پیش کریں گے۔

7۔ وکلاء محاذ پر یعنی ڈیموکریٹک لائرز ایسوسی ایشن کی تشکیل کے لئے پہلے پارٹی کے وکلاء ساتھی اپنے اپنے شہروں میں پارٹی کے اراکین جو وکلاء ہیں ان کے اجلاس منعقد کریں اور اپنے شہر یا صوبے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے DLA کے حوالے سے وسیع تر ہم خیال وکلاء کے اجلاس بلانے کے بارے میں فیصلہ کریں اور تنظیمی شکل دیں، شہری طور پر کمیٹیاں تشکیل دینے کے بعد صوبائی اور مرکزی اجلاس یا کانفرنس منعقد کی جائیگی۔ کراچی میں ذمہ داری جمیل شاہد اور شوکت حیات صاحب اور لاہور میں زاہد پرویز اور نعیم شاکر صاحب، اسی طرح ملتان، خانیوال، اوکاڑہ، قصور، فیصل آباد، جھنگ، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، راولپنڈی اسلام آباد اور دیگر شہروں میں وکلاء ساتھیوں سے رابطہ کر کے اجلاس منعقد کئے جائیں۔ سیکرٹری جنرل رابطے کا کام کریں گے۔

8۔ کسان محاذ کے حوالے سے فیصلہ کیا گیا۔ چوہدری فتح محمد کمیٹی تشکیل دیں گے اور 15 اپریل 2011 سے قبل لاہور میں کسان ریلی منعقد کی جائے گی۔

9۔فیض صدی کے حوالے سے پارٹی کی طرف سے تقریبات منعقد کی جائیں گی۔ فیصلہ کیا گیا کہ اپریل 2011 میں راولپنڈی اسلام اباد، اکتوبر 2011 لاہور، نومبر 2011 سانگھڑ اور پنجاب پارٹی اپنے اجلاس میں فیصلہ کرے گی کہ جن جن شہروں میں پارٹی تنظیم ہے ان شہروں میں کن تاریخوں میں تقریبات منعقد کریں گے۔

10۔عوامی جمہوریت مالی مشکلات سے دوچار ہے اس کے لئے فنڈز جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اختر حسین، صدیق ڈوگر، منظور رضی اور اے۔آر۔عارف نے مضامین ارسال کرنے کی بھی ذمہ داری لی۔

11۔قومی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے متحدہ محاذ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا مگر اس کی عملی صورت حال اور ماضی کے تجربات کے حوالوں سے پارٹی محسوس کرتی ہے کہ جب تک پارٹی تنظیم منظّم و متحرک نہیں ہوتی خاص کر دو صوبوں یعنی پنجاب اور سندھ میں اس وقت تک متحدہ محاذ کی تشکیل اور فعال ہونے میں مشکلات ہونگی۔قومی و بین الاقوامی تجربات کے حوالوں سے مارکسی نظریاتی مسائل پر بھی غور و خوض اور بحث کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں چونکہ کافی تعداد میں اراکین حاضرین نہیں ہیں لہٰذا ان موضوعات پر اگلے اجلاس میں تفصیلاً غور کیا جائے گا۔ آئندہ سنٹرل کمیٹی کا اجلاس تین روزہ ہوگا جو لاہور میں 6,7,8 مئی 2011 کو ہوگا جس کا ایجنڈہ بعد میں جاری کیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

ورکرز پارٹی پاکستان پنجاب کا اجلاس

ورکرز پارٹی پنجاب سیکرٹریٹ کا اجلاس مورخہ 20 مارچ 2011ء کو بوقت 11 بجے دن 5 میکلوڈ روڈ لاہور پر منعقد ہوا۔جس کی صدارت صوبائی صدر چوہدری فتح محمد صاحب نے کی۔اجلاس میں عہدیداران کے علاوہ ممبران صوبائی مجلس عاملہ نے بھی شرکت کی۔شرکاء میں محمد ظہور خان، حمزہ ورک، غلام دستگیر محبوب، بشیر ظفر، محمد شفیع خان ٹانگرہ، عارف ایاز، راجہ ولایت، نصیر ہمایوں، عمران، شعیب، عابدہ چوہدری، فرحت عباس، عاشق حسین، عبدالعزیز اور زاہد پرویز ایڈووکیٹ شامل تھے۔ علاوہ ازیں سنٹرل کمیٹی کے رکن محمد اسلم ملک اور نعیم شاکر مرکزی ڈپٹی سیکرٹری جنرل نے بھی شرکت کی۔ ایجنڈا پر بحث و مباحثہ کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

1۔صوبائی اجلاس کے فیصلے تمام اضلاع کو منعقدہ اجلاس کے ایک ہفتہ کے اندر بذریعہ سرکلر ارسال کئے جائیں گے۔

2۔تمام اضلاع کے ضلعی عہدیداران کے نام، پتہ جات اور ٹیلی فون نمبرز صوبائی جنرل سیکرٹری کو ایک ہفتہ کے اندر پہنچائے جائیں اور یہ ذمہ داری متعلقہ ضلعی صدر اور سیکرٹری کی ہوگی۔

3۔رکن صوبائی مجلس عاملہ زاہد پرویز کو سیکرٹری فنانس بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

4۔نعیم شاکر صاحب کو پارٹی بروشر (مختصر تعارف) تیار کر کے صوبائی سیکرٹری کے حوالے کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

5۔تمام اضلاع میں پارٹی سے وابستہ وکلاء کو پارٹی کے لائیرز ونگ (ڈیموکریٹک لائیرز فورم) کے لئے کام تیز کرنے کی ہدایت کی گئی۔آئندہ مئی 2011 میں DLF کا صوبائی کنونشن متوقع ہے جس کی ابھی سے تیاری ضروری ہے۔

6۔سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 19-20 فروری 2011 کے فیصلے کی روشنی میں خانیوال سے ناصر اقبال سہو کو صوبائی مجلس عاملہ کا ممبر قرار دیا گیا۔

7۔سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ماہ اپریل 2011ء میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے لئے لاہور میں مجوزہ ریلی/مظاہرہ کے پروگرام کو بوجہ گندم کٹائی ملتوی کیا گیا اور مظاہرے کے لئے 27 مئی 2011ء بروز جمعہ کی تاریخ مقرر کی گئی جس کے لئے پنجاب کے عہدیداران ماہ اپریل میں اپنے دوروں کے دوران ضلعی پارٹیوں کو متحرک کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ ساتھیوں کی شرکت کو یقینی بنایا جاسکے۔

8۔صوبائی سطح پر قائم تین رکنی صوبائی کمیٹی کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ موجودہ سیاسی صورتحال پر غور و خوض کے بعد دستاویز تیار کر کے صوبائی مجلس کے آئندہ اجلاس میں بحث کے لئے پیش کرے گی۔

9۔ضلعی سطح پر قائم کمیٹیوں کے اجلاس کے لئے حسب ذیل پروگرام بنایا گیا:

(i) 27 مارچ بروز اتوار 11 بجے دن پاکپتن

(ii) 2 اپریل بروز ہفتہ 3 بجے سہہ پہر لاہور

(iii) 7 اپریل بروز جمعرات 12 بجے دوپہر ٹوبہ ٹیک سنگھ

(iv) 8 اپریل بروز جمعہ 2 بجے دوپہر فیصل آباد

(v) 9 اپریل بروز ہفتہ 5 بجے شام قصور

(vi) 9 اپریل بروز ہفتہ خانیوال

(vii) 10 اپریل بروز اتوار بوقت 10 بجے صبح ملتان

(viii) 16 اپریل بروز ہفتہ وہاڑی

(ix) 17 اپریل بروز اتوار لودھراں

(x) 23 اپریل بروز اتوار راولپنڈی

ان پروگراموں میں مرکزی و صوبائی عہدیداران شرکت کریں گے۔متعلقہ ضلعی کمیٹیاں ان ایام میں عوامی و سیاسی اجتماعات بھی ترتیب دیں تاکہ مقامی سطح پر پارٹی کا کام عوامی سطح پر پھیلایا جاسکے۔

ورکرز پارٹی پاکستان دنیا پور کی تحصیل سطح پر کانفرنس

رپورٹ: مہر وقار حسین

6 مارچ 2011ء بروز اتوار بوقت 11 بجے تحصیل دنیا پور ورکرز پارٹی کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقد کی گئی جسکی صدارت ورکرز پارٹی پاکستان کے ضلعی صدر چوہدری عبدالطیف مغل نے کی جبکہ مہمانان صوبائی جنرل سیکرٹری چوہدری ظفر اقبال ایڈووکیٹ ،این ،ایس ،ایف کے صوبائی صدر عرفان احمد چوہدری تھے۔نظامت کے فرائض شفیق الماس نے ادا کئے انہوں نے کانفرنس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ورکرز پارٹی پاکستان کے انقلابی منشور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نوجوان طالب ،این ،ایس ،ایف کے سکول میں شرکت کریں اور اسکے پروگرام کو مشن کے طور پر جاری رکھیں۔ کانفرنس میں تقریباً 100 اراکین پارٹی نے شرکت کی جس میں این ایس ایف سے تعلق رکھنے والے نوجوان طالب علموں نے کثیر تعداد میں شرکت کی ،کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے اپنی انتھک کوششوں کے ذریعے پارٹی دفتر کو خوبصورت بینروں سے سجایا گیا تھا۔جن میں انقلابی نعرے درج تھے،تحصیل دنیا پور پارٹی کے عہداداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا جو درج ذیل ہے۔

برائے صدارت: چوہدری مختار احمد صحرائی

نائب صدر: ڈاکٹر اسماعیل ثانی

جنرل سیکریٹری: چوہدری اصغر نسیم

ڈپٹی سیکریٹری: ماسٹر چوہدری محمود فاروق

سیکریٹری برائے طلبا امور و نوجوانان: محمد آصف شیخ

سیکرٹری زراعت: چوہدری محمد اشرف

برائے لیگل ایڈوائزر: جناب امداد علی ڈوگر ایڈووکیٹ

برائے مجلس عامہ: چوہدری اللہ رکھا ڈوگر، حافظ محمد سعید، چوہدری محمد سلیم نمبردار، محمد اقبال، مہر اکرم، امداد علی ڈوگر ایڈووکیٹ ،منتخب ہوئے جن کا باقاعدہ اعلان صوبائی جنرل سیکریٹری ورکرز پارٹی پاکستان چوہدری ظفر اقبال ایڈووکیٹ نے کیا اور تمام منتخب عہدیداران و اراکین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ تمام دوستوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پارٹی کا انقلابی منشور عوام الناس میں متعارف کروائیں اور پارٹی کو منظم اور متحرک کرنے کیلئے اپنی آراء دیں۔اور عوامی مسائل کے حل کیلئے جدوجہد کو تیز کریں۔

انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ پاکستان کی تاریخ میں حالیہ سیلاب میں جو تباہی ہوئی ہے اُسکے متاثرین آج بھی کھلے آسمان کے نیچے غیر انسانی ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔اُنکے نام پر عالمی امداد حکمرانوں کا کرپٹ ٹولہ ہضم کر چکا ہے۔دیگر مقررین میں عرفان احمد چوہدری ،معروف ترقی پسند دانشور ملک الٰہی بخش ،امداد علی ڈوگر ایڈووکیٹ ،،پروفیسر ماجد فاروق، پروفیسر نذیر احمد ،ملک اطہر سعید، ترقی پسند شاعر طارق انجم، چوہدری اصغر نسیم ،محمد آصف شیخ اسلم شاہد، زبیر بابر چوہدری اور مہر وقار حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج عوام کے سامنے دو ہی راستے ہیں ایک انقلاب کا راستہ دوسرا ظلم اور بربریت کا۔وہ نظام جس کا خاتمہ اب یقینی ہو چکا ہے اس لئے ملک میں ہر گھر سے بھوک و افلاس کا شور اٹھ رہا ہے۔مگر یہ شور اہل اقتدار کو سنائی نہیں دیتا۔

آخر میں چوہدری عبدالطیف مغل نے اپنے صدارتی خطاب میں تمام شرکاء اور مہمانان گرامی کا شکریہ ادا کیا اور مزید زور دے کر کہا کہ ورکرز پارٹی پاکستان کی رکنیت سازی کے عمل کو تیز تر کیا جائے اور عوامی رابطوں کے ذریعے پارٹی کے عوامی منشور کو عام کیا جائے۔کانفرنس میں پاس کی گئی قراردادیں درج ذیل ہیں۔

1۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تحصیل دنیا پور کے طلباء و طالبات کے لئے فری ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے۔دنیا پور میں ٹیکنیکل کالج اور زرعی کالج کا قیام عمل میں لایا جائے۔

2۔ہر یونین کونسل کی سطح پر ایک ہائیر سیکنڈری سکول کا قیام عمل میں لایا جائے۔

3۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تحصیل دنیا پور کی خستہ حال سڑکوں کی حالت کو بہتر بنا کر ٹریفک سگنل کے نظام کو درست کیا جائے۔

4۔ہم یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کر کے زمین مقامی کسانوں میں مفت تقسیم کی جائے۔بیج اور کھاد کی قیمتوں میں فوری کمی کی جائے۔پٹرولیم مصنوعات کو بھی کنٹرول کیا جائے۔

5۔عالمی سامراجی قرضے واپس دینے سے انکار کیا جائے اور عوام کی لوٹی ہوئی دولت عوام پر خرچ کی جائے۔

6۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں جاری فرقہ پرستی کے نام پر دہشت گردی بند کی جائے اور وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور شہباز بھٹی کے قتل عام کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔

7۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تحصیل دنیا پور کے شہریوں کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا جائے اور شہر کو صاف ستھرا رکھنے اور تفریحی پارکوں کو فروغ دیا جائے تا کہ وطن عزیز کے نوجوان صحت مندانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

8۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہسپتالوں میں صحت کی بنیادی سہولیات مہیا کی جائیں ان میں ماہر ڈاکٹر بھرتی کئے جائیں تا کہ لوگ مقامی طور پر اپنا علاج کروا سکیں۔

9۔ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تحصیل دنیا پور میں جدید طرز کی لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے تا کہ جدید علوم کے ذریعے نوجوانوں میں لگن اور شوق کے جذبے کو بیدار کیا جا سکے۔اور ہم قرارداد کے ذریعے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ شاہانہ حکومتی اور انتظامی اخراجات میں کمی کی جائے۔

☆☆☆☆☆

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کو چہرہ خون سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رشتہ کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

ورکرز پارٹی پاکستان کیا چاہتی ہے؟

ماسٹر الٰہی بخش

ورکرز پارٹی پاکستان لودھراں کی ضلعی کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ماسٹر الٰہی بخش نے پارٹی کے پروگرام کو بیان کرتے ہوئے کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ علاقہ کے شہریوں کو پارٹی کا پروگرام پیش کریں اوران سے اپیل کریں کہ وہ ورکرز پارٹی پاکستان میں شامل ہوکر سیاسی قوت بنیں تا کہ عوام کے مسائل کا حل جلد از جلد ہو سکے۔انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ ورکرز پارٹی پاکستان کیا چاہتی ہے۔ ملک سے ریاستی اورمذہبی دہشت گردی کا خاتمہ چاہتی ہے۔بے روزگاری ،غربت اور جہالت کا خاتمہ چاہتی ہے۔ہرفرد کے لئے صحت تعلیم رہائش کی ضمانت چاہتی ہے۔ملک سے جاگیرداری قبائلی اور گماشتہ سرمایہ داری کی لعنتوں سے نجات چاہتی ہے۔ملٹی نیشنل کمپنیوں کی لوٹ کھسوٹ کو روکنا چاہتی ہے۔ورلڈ بینک آئی ایم ایف اورایشین بینک کے قرضوں سے چھٹکارہ چاہتی ہے ۔فوجی وسول افسران کی زرعی زمینوں کی الاٹمنٹوں کی منسوخی چاہتی ہے۔سرکاری زمینوں کو کسانوں اور چھوٹے مالکان 12/1/2 فی ایکٹر فی خاندان دینا چاہتی ہے کسانوں کیلئے کھاد بیج سپرے کی قیمتوں میں کمی چاہتی ہے۔سیلابوں کی روک تھام کیلئے نئے ڈیم بنانا چاہتی ہے آبپاشی کے نظام کو جدید بنانا چاہتی ہے ۔ملک میں صنعتی انقلاب لانا چاہتی ہے بیمار صنعتوں کی بحالی اور چھوٹی صنعتوں کا قیام چاہتی ہے ہرفرد کیلئے روزگار کا حصول چاہتی ہے۔

ملک میں ٹیکس اصلاحات چاہتی ہے قابل ٹیکس آمدنی زرعی وتجارتی آمدنی پر انکم ٹیکس کا نفاذ چاہتی ہے ٹیکس وصولی کا نظام شفاف اور کرپشن سے پاک بنانا چاہتی ہے۔

اداروں کو اپنی اپنی حدود میں رکھنا چاہتی ہے ان میں ٹکراؤ اور اختیار سے تجاوز روکنا چاہتی ہے۔میرٹ پر ملازمتوں کا حصول چاہتی ہے۔ بے ہنر مزدور کی سیلری ایک تولہ سونا کے برابر چاہتی ہے۔ملک میں یکساں نظام تعلیم لاگو کرنا چاہتی ہے اور تعلیم مفت اور لازمی نفاذ چاہتی ہے۔ملک میں برداشت ہم آہنگی کے جذبے کو فروغ دینا چاہتی ہے غیر یقینی اور خوف کی فضا کو امن میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔

پاکستان کو خوشحال ترقی یافتہ جمہوری ملک بنانا چاہتی ہے۔ملک میں موجود اقلیتوں کی جان و مال عزت آبرو کا تحفظ چاہتی ہے۔ملک میں متناسب نمائندگی کی بنیاد پر کسانوں مزدوروں کیلئے اسمبلیوں میں نشستیں دلانا چاہتی ہے۔

آزاد خارجہ پالیسی ملک کے مفادات مطابق چاہتی ہے جو خودمختاری کی ضامن ہو ملک بیرونی قرضوں سے نجات دلانا چاہتی ہے۔ پاکستان کے ہمسایہ ممالک او رعوام سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات استوار کرانا چاہتی ہے۔ملک میں غیر ملکی ایجنسیوں کی مداخلت کو روکنا چاہتی ہے اور سیاسی معاملات میں غیر ملکی حکمرانوں کی مداخلت بلاجواز سمجھتی ہے۔ملک غیر قانونی غیر ملکی افراد کی آمد کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ملک میں قانونی اسلحہ اور غیر قانونی اسلحہ کے کاروبار کا خاتمہ چاہتی ہے۔

ورکرز پارٹی پاکستان تحصیل دنیاپور کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

فیصل آباد میں عالمی یوم خواتین منایا گیا

عارف ایاز

عالمی یوم خواتین کے سلسلہ میں 8 مارچ 2011ء کو ورکرز پارٹی پاکستان فیصل آباد اور تنظیم برائے پائیدار ترقی کے اشتراک سے اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت محترمہ امینہ زمان نے کی۔ اجلاس میں پارٹی کارکنوں اور خواتین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس سے نازیہ سردار، شازیہ جارج، ازرینہ عارف، ساجد اقبال صفدر، رابعہ جعفری اور حنیف احمد ڈوگر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ نے خطاب کرتے ہوئے عالمی یوم خواتین کی اہمیت، خواتین کے مسائل اور سماج میں خواتین کے کردار پر سیر حاصل بحث کی اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کی آدھی آبادی جو خواتین پر مشتمل ہے اگر منظم اور متحرک کر لی جائے تو ملک کے موجودہ فرسودہ اور استحصال نظام سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

اجلاس کی صدر امینہ زمان نے خطاب کرتے ہوئے کہ ایک طرف دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کی طفیل ترقی کی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہے انسانی سماج تہذیب وتمدن کی بتدریج ارتقائی منازل طے کر کے جمہوری نظام کو تسلیم کرتے ہوئے فلاحی ریاستیں قائم کر چکی ہے جبکہ ہماری خواتین نہ صرف جاگیر دارانہ اور قبائلی نظام کے ظالمانہ شکنجہ کا شکار ہیں بلکہ ہمارا ملک ابھی مذکورہ ظالمانہ نظام سے آزاد نہیں ہو سکا۔

خواتین کے ساتھ ناروا سلوک اور امتیازی رویہ نہایت جاہلانہ اور تشدد آمیز ہے۔ ریاستی قوانین، خواتین کی آزادی اور ترقی میں حائل ہیں۔ ملک کے کئی علاقوں میں عورت ووٹ کے بنیادی حق سے محروم ہے۔ تعلیم اور علاج معالجہ کے حق سے محروم ہیں۔ اقتصادی اور سماجی سطح پر امتیازی سلوک خواتین کو اپنا کردار ادا کرنے میں روکاوٹ ہے۔

بھٹہ پر کام کرنے والی خواتین زندگی کی بنیادی سہولتوں اور ضروریات سے محروم ہیں۔ انہیں کام کے بدلے پوری اجرت نہیں دی جاتی۔ جنسی اور سماجی تشدد کیا جاتا ہے۔ شہروں میں کچی آبادیاں تعلیم کے بنیادی حق سے محروم ہیں۔

انہوں نے کہا سرکاری سکول کم ہونے کی وجہ سے گلی گلی پرائیویٹ سکول کھلے ہیں جہاں تعلیم یافتہ خواتین پڑھا رہی ہیں مگر ان کی اجرت دو ہزار سے تین ہزار تک ماہانہ ہے مگر حکمران اور سکول مالکان اس شرمناک رویہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے سات ہزار روپے کم از کم اجرت مزدور کیلئے مقرر کی ہے مگر حکومت اس اعلان پر عمل کرنے کیلئے سنجیدہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ فیکٹریوں اور ٹیکسٹائل اور گارمنٹس کی صنعت میں خواتین کی کثیر تعداد کام کر رہی ہے مگر ان کی تنخواہیں اس قدر کم ہیں کہ خواتین ایک عزت دار زندگی نہیں گزار سکتی۔

انہوں نے کہا خواتین کی جدوجہد دراصل اجتماعی جدوجہد کا حصہ ہے جب تک خواتین جبر اور تشدد کے خلاف مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد سے شریک نہیں ہوتیں۔ ملک میں سماجی تبدیلی برپا نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے کہا ورکرز پارٹی پاکستان اس جدوجہد میں آپ کے ساتھ ہے انہوں نے کہا کہ سیاسی جدوجہد کو تیز کرنے اور سماج کے وسیع تر حلقوں کو شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک میں ایک پرامن، ترقی پسند، خوشحال معاشرہ قائم کیا جائے اور موجودہ ظالمانہ نظام سے نجات حاصل کی جائے۔

بقیہ: مسلم شمیم

پسند تحریک کی سرپرستی کی تھی۔ یہ بات بے محل نہیں کہ 1925ء میں جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا کان پور میں تاسیسی اجلاس ہوا تھا، اس کی تنظیمی کمیٹی کے چیئرمین مولانا حسرت موہانی تھے اور مولانا آزاد سبحانی اس کے وائس چیئرمین تھے۔ مذکورہ عظیم شخصیات کے مذہب سے شغف اور والہانہ وابستگی سے کون واقف نہیں اور وہ ترقی پسند تحریک پر کفر والحاد کے الزام کو شدت کے ساتھ رد کرنے والوں میں تھے اور ترقی پسند فکر اور تحریک کے لئے ان کی خدمات گراں قدر کہی جاسکتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی معنویت کی حامل ہے کہ فریڈرک اینگلز نے اپنی عظیم مارکسی فلسفیانہ تصنیف 'Anti-Duhring' میں یہ بات بڑے غیر مبہم الفاظ میں کہی ہے کہ اشتراکی معاشرے میں ضمیر کی آزادی کو کلیدی اہمیت حاصل ہوگی۔ مذہب کے خلاف جہاد کا نعرہ جو جرمن دانشور Duhring نے لگایا تھا، فریڈرک اینگلز نے اس کی شدید مذمت اور مخالفت کی تھی اور اس کی رد میں مذکورہ کتاب 'Anti-Duhring' لکھی تھی۔ ان معروضات کی روشنی میں میں پروفیسر احمد علی کی ترقی پسندیت اور ان کی نگارشات کو ترقی پسندیت کے بلند تر معیارات کا حامل سمجھتا ہوں۔ ان کی اردو اور انگریزی ہر دو زبانوں میں نگارشات اور تخلیقات کو ترقی پسند ادب کے خزینے میں گراں مایہ اضافہ اور ترقی پسند ادب کا عظیم اثاثہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور علیحدگی ان کی ترقی پسندیت کے حوالے سے کوئی معنویت نہیں رکھتی۔

حوالہ جات:

☆''روشنائی'' سید سجاد ظہیر

☆''منزلیں گرد کے مانند'' خلیق ابراہیم خلیق

☆''پروفیسر احمد علی۔ حیات اور ادبی خدمات'' ڈاکٹر محمد کامران

☆''اردو ادب کی تحریکیں'' ڈاکٹر انور سدید

☆☆☆☆☆

مانچسٹر : فیض احمد فیض کو پاکستانیوں سمیت مختلف کمیونٹیز کا خراج عقیدت

فیض احمد فیض نے اپنی تمام زندگی دنیا بھر کے مظلوموں کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنے میں گزاری

تقریب میں فیض کی عظمت کو سلام کرنے کے ساتھ پاکستان کی صورتحال پر آنسو بھی بہائے جارہے تھے

بریڈفورڈ کی ڈائری۔۔ظفر تنویر۔۔نمائندہ جنگ

ٹیلیفون کی گھنٹیاں بج رہی ہیں،لوگ باگ اکٹھے ہورہے ہیں،کوئی لیڈز سے آرہا ہے کوئی ہیلی فیکس سے اور سبھی اس قافلے میں شامل ہورہے ہیں۔جو بریڈفورڈ سے مانچسٹر جارہا ہے،جہاں ایک میلہ لگا ہوا ہے۔یہ میلہ ہی تو تھا اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ،کس طرح سموسوں کا سٹال لگا ہے،کہیں کتابیں بک رہی ہیں اور ہر طرف لوگوں کا منہ میٹھا کروایا جارہا ہے۔لڑکیاں مٹھائیوں کے ٹوکرے اٹھائے پورے ہال میں گھوم رہی تھیں اور اصرار کرکے لوگوں کا منہ میٹھا کروارہی ہیں۔

آج کا میلہ فیض کا میلہ ہے اور فیض کی تعلیمات کا ہی فیض ہے کہ لوگ دوردراز کے شہروں سے قافلوں کی شکل میں مانچسٹر پہنچ رہے ہیں۔میں بھی ایسے ہی ایک قافلے کا حصہ ہوں جو بریڈفورڈ سے خاص طور پر فیض میلہ میں شرکت کیلئے مانچسٹر کے پاکستان کمیونٹی سنٹر پہنچا ہے۔بریڈفورڈ کا ذکر ہی کیا یہاں تو لیڈز سے لندن تک کے بہت شہروں کی نمائندگی ہے۔ممتاز براڈ کاسٹر رضا علی عابدی خاص طور پر لندن سے آئے ہیں۔

لندن سے آنے والے ایک قافلہ کی قیادت مشتاق لاشاری کررہے ہیں۔بریڈفورڈ سے پروفیسر نذیر تبسم ،پرویز فتح،خالد سعید قریشی،یونس لالہ،برمنگھم سے عباس ملک اور مختار ڈار بھی اپنے اپنے قافلہ کے ساتھ ہال میں موجود ہیں صرف پاکستانیوں یا کشمیریوں کا ہی ذکر کیوں،یہاں بھارتی بھی اور بنگالی بھی انگریز بھی اور ایسٹ افریقن بھی،ہندو،مسلم،سکھ،عیسائی سبھی،یک زبان ہوکر اس شخص کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے یہاں جمع ہیں جس نے اپنی تمام زندگی دنیا بھر کے مظلوموں محکموں اور کچلے ہوئے انسانوں کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنے میں خرچ کردی۔

2011ء فیض احمد فیض کے صدسالہ یوم پیدائش کے حوالہ اسلئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس سال فیض کیلئے اسلام آباد قصر صدارت کے وہ دروازے بھی کھول دیئے گئے جہاں سے ہمیشہ فیض کی آواز دبانے کے احکامات ہی جاری ہوتے تھے۔

پاکستان کے بچھڑے بنگالی بھائی بھی فیض کی جدوجہد کو خراج پیش کرنے کیلئے فیض کی نظم ''ہم کے ٹھہرے اجنبی'' درد کی پوری شدت سے گارہے تھے۔فیض احمد فیض کی صدرسالہ تقریبات پورے برطانیہ میں منعقد کی جارہی ہیں۔مانچسٹر میں ہونے والی یہ تقریب اس سلسلہ کی افتتاحی تقریب تھی جہاں مقررین فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے۔

رضا علی عابدی کہہ رہے تھے کہ فیض کا کلام اور مخاطب پوری دنیا کے مظلوم انسان ہیں انہوں نے ہر ملک اور ہر مذہب،ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگوں کیلئے آزادی ،حریت،عدل انصاف اور مساوی بنیادوں پر ترقی ،خوشحالی اور کامیاب مستقبل کی بات کی ہے اور ان کے اسی کردار کی وجہ سے وہ دنیا بھر میں عزت واحترام رکھتے ہیں،جہاں فیض صاحب کی عظمت کو سلام کیا جارہا تھا وہیں پاکستان کی موجودہ صورتحال پر آنسو بھی بہائے جارہے تھے۔دہشت گردی کے ذریعہ عام انسانوں کے قتل عام سے لیکر شہباز بھٹی اور سلمان تاثیر جیسے رہنماؤں کے قتل پر احتجاج بھی کیا جارہا تھا اور یہ کہا جارہا تھا کہ فیض احمد فیض کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں کہ ان کی شخصیت اور فن پر مکالمے پڑھے جائیں،ان کا انقلابی کلام پڑھ کر سنایا جائے اور اپنا فرض پورا سمجھا جائے۔فیض کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی روشنی میں جہالتوں کے اس اندھیرے کو ختم کیا جائے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی جان لے رہا ہے،ایک ایسا اندھیرا جس نے پاکستان کو مذہب،رنگ اور نسل کی بنیاد پر تقسیم کررکھا ہے جہاں شہباز بھٹی جیسے لوگوں کو دن دیہاڑے قتل کردیا جاتا ہے اور جہاں لوگ اسلئے نہیں بولتے کہ انہیں ڈر ہے کہ ان پر بھی توہین تہمت نہ لگا دی جائے۔فیض نے صحیح ہی کہا تھا کہ:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست وناخن قاتل نہ آستیں پہ نشان
نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

☆☆☆☆☆

فیض اَمن میلہ کے سلسلہ میں ورکرز پارٹی پاکستان پنجاب کے راہنما کامریڈ نصیر ہمایوں مہمان شبانہ اعظمی کو سِلور میٹل پیش کر رہے ہیں
ان کے ہمراہ جٹ برادران ایلا ارون اور سلیمہ ہاشمی کھڑے ہیں

فیض اَمن میلہ ۔ اوپن ایئر تھیٹر لاہور کی سٹیج پر بھنگڑا

سائیں اختر لاہوری کی یاد میں استاد دامن اکیڈمی کے زیر اہتمام اجلاس۔ سٹیج پر کامریڈ نصیر ہمایوں دیگر مقررین کے ہمراہ بیٹھے ہیں۔

CPL NO. 279

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
March, 2011 LAHORE

دستور

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لیکر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے

ایسے دستور کو صبح بے نُور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں جانتا

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے

ظلم کی بات کو ، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

تم نے لُوٹا ہے صدیوں ہمارا سُکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں

تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے ، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

شاعرعوام حبیب جالب

شاعرعوام حبیب جالب ۲۴ مارچ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ایک بھرپور عوامی زندگی گزار کر ۱۳ مارچ ۱۹۹۳ کو اس دُنیا سے رخصت ہوئے ان پر ایک تفصیلی مضمون آئندہ شمارہ میں پیش کیا جائے گا۔